ماہِ نو

فروری ۱۹۸۳ء

صدر مجلس ادارت — انوار احمد
چیف ایڈیٹر — فضلِ قدیر
ایڈیٹر — علی محمد حسینی
جائنٹ ایڈیٹر — قائم نقوی

ترتیب

اپنی باتیں — ف۔ق — ۲

بیادِ غالب

نظمیں
عبدالعزیز خالد — ۳
ماجد الباقری — ۴
خالد احمد — ۵

مضامین

غالب اور جدید ذہن — ڈاکٹر وزیر آغا — ۶
غالب خستہ کے بغیر — ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار — ۱۱
"غالبیات" ایک مستقل شعبۂ ادب — ڈاکٹر سید معین الرحمٰن — ۱۵
رثائے غالب میں انیس کی رباعی — محمد صادق صفوی — ۱۹
غالب اقبال کے عظیم پیشرو — ڈاکٹر محمد ریاض — ۲۱
حیاتِ غالب کے خدوخال — (ادارہ) — ۲۵

ایک شاعر ــ خصوصی مطالعہ

سوانحی خاکہ (خود نوشت) — سید مظفر حسین رزمی — ۲۹
رزمی کی شاعری پر ناقدین کے تاثرات — سلیم احمد / نظیر صدیقی — ۳۱
خواب کی ریت — رئیس امروہوی — ۳۳
کلامِ رزمی — ۳۴

انشائیے

تیسرے درجے کا مسافر — صدیق راعی — ۳۷
آپ اور ہم — محمد حمید شاہد — ۴۰

نظمیں — ۴۱—۴۳
احسن علی خان، اکبر کاظمی، سید یٰسین قدرت، شاہین مفتی، ماہ طلعت زاہدی،

افسانے

منظر اک بلندی پر — تقی حسین خسرو — ۴۴
کونپل اور کرنیں — ڈاکٹر حسرت کاسگنجوی — ۴۷
لمحے کا زندانی — عابدہ نرجس — ۵۱

غزلیں — ۵۶—۵۸
اختر انصاری اکبر آبادی، گوہر ہوشیار پوری، محمود شارب، غلام حسین ساجد، غلام محمد قاصر، نصرت صدیقی، لطیف ساحل، شاہدہ کیانی، ایوب ندیم،

نقد و نظر — ۵۹
جمال سویدا کے شعر شعر، باد بک دست، سچائیاں، زخم فلسطین، تحقیق غالب،

سرورق ـــ مشتاق احمد

جلد نمبر ۳۶ ـــ شمارہ نمبر ۲
قیمت: عام شمارہ دو روپے

طلبا کیلئے مع رجسٹری فیس ۲۰ روپے
سالانہ چندہ مع رجسٹری فیس ۳۰ روپے

رجسٹرڈ ایل نمبر ۸۱۱۸
فون نمبر ۳۰۴۴۴۲۲۳

مطبوعات پاکستان نے دین محمدی پریس بل روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ماہ نو ۳۲-اے حبیب اللہ روڈ لاہور سے شائع کیا۔

اپنی باتیں

۱۵ فروری کو غالب کا ناشہ عمر طے ہوا تو اکمل الاخبار نے اس کی خبر ان الفاظ میں دی تھی:
"۔۔۔۔۔ آسمان درپئے آزار ہے، بھلا اس سے کیا توقع آسودگی کی جس کا خود گردش پر مدار ہے دیکھو بیٹھے بٹھائے کیا آفت اٹھائی ہے کس منتخبِ روزگار کی جدائی دکھائی ہے۔ نخل برومند سے معانی کو بادِ خزاں سے گرایا، مہرِ سپہر سخندانی کو خاک میں ملایا۔"
اس خورشیدِ اوجِ غزل کی یاد منانا ہماری قدیم روایت ہے اور اسی کے تحت اس شمارے میں ہم نے محفلِ غالب کی شمع روشن کی ہے اور یہ بات فروری ہی سے مخصوص نہیں ہم تو اُس صاحبِ کمال کی یاد منانے کا بہانہ ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ کہ

فلک کو دیکھنا، تقریب ترے یاد آنے کی

غالب نے سوزشِ دل سے جو سخن ہائے گرم لکھے ان کی حدت و حرارت آج بھی تازہ ہے اور یہ ان کی ہمہ گیری اور ان کے کلام کی آفاقیت کی بڑی مستحکم دلیل ہے۔ کلامِ غالب آج بھی لوگوں کے لبوں سے چمٹا ہوا ہے اور سر دھنتے سامعین بے ساختہ یہ کہنے پر مجبور ہیں ؎

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

اس شمارے میں ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر معین الرحمان اور ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے ہی گنجینۂ معانی کے طلسم کو اپنے خاص انداز میں وا کیا ہے اور تہہ در تہہ فلسفوں نے باریک زاویے روشن کئے ہیں ۔ ہم نکتہ داں شاعر جناب عبدالعزیز خالد کے ممنون ہیں کہ انہوں نے ہماری درخواست پر منظوم خراجِ عقیدت سے نوازا جو نذرِ قارئین ہے۔
غالب کا کلام مغلیہ تہذیب و ثقافت کا بہترین مظہر ہے جس کی تشکیل ماوراءالنہری تہذیب اور اسلامی اقدار کے امتزاج سے ہوئی اس تہذیب و ثقافت کو نمایاں کرنے میں ہمارے شہر لاہور کے عظیم مصوّر اور غالب شناس مرحوم عبدالرحمان صاحب چغتائی نے گراں بہا خدمات غالب کے کلام کو مصوّر کرکے انجام دیں ۔ غالب کی محفل ہو تو ان کی یاد نسیمِ جانفزا کی طرح دل و دماغ کو پُرکیف بنا دیتی ہے ۔ خدا مرحوم کی خدمات سے ہمیں غافل نہ کرے وہ ہماری تہذیب و ثقافت کو جس انداز میں عکس بند کرگئے ہیں وہ اپنی جگہ اتنا عظیم کام ہے جس کی ہمسری کوئی اور نہیں کرسکتا۔
خدا کرے پیش کردہ شمارے کے مضامین قارئین کے مرغوب طبع ہوں۔

[signature]

غالب

عبدالعزیز خالد

سارے انسانوں کے دُکھ درد کا تو شاعر ہے
تُو نے اظہار کے پیرایوں کو وسعت دے کر
جنسِ نایاب ہے شاعر، مُتشاعر تو بہت
وقت کی پھونک چراغوں کو بُجھا دیتی ہے
فن سَمندر ہے رہے سینۂ پُر آذر میں
نہ ملے شہرتِ جاوید بلا استحقاق
لذّتِ فکرِ سخن نے تجھے آزادہ روی
دستِ آزر بھی ملا تجھ کو یدِ بیضا بھی
حُسن والوں سے ہے کس کس جگہ پیغام وسلام
زندگی بے مَے و معشوق کہاں کٹتی ہے
بکھری کس شب ترے بازو پہ نہ زلفِ شبرنگ؟
کیوں نہ اوضاعِ زمانہ ہوں طبیعت کے خلاف
حُزنِ یعقوب بھی، اندوہِ زلیخا بھی ہے
صدفِ گوہرِ گنجینۂ معنیٰ، ہر لفظ
رہے ہر وقت ترے گرد خیالوں کا ہجوم
چمنستانِ تفکر ہے تری جولانگاہ
عصر سے تیری انا برسرِ پیکار بھی ہے
گرچہ بندوں کی خدا وندی سے انکار بھی ہے
بے نیازی بھی ہے مدّاحیٔ سرکار بھی ہے
زَعمِ خُود بینی و آزادہ روی کے باوصف
نظر آتا ہے ترے قول و عمل میں جو تضاد
روشِ عام کو سمجھے تو اہانت اپنی
کوئی قدغن، کوئی بندش نہ کوئی پابندی
خُود پرستی کا مداوا، غمِ ہستی کا علاج
رونا آساں، مگر آساں نہیں ہنسنا خُود پر
آشنائی ہے فقیہانِ حرم سے بھی تری
خالدؔ و حالیؔ و اقبالؔ پہ موقوف نہیں

تری آواز میں شامل ہے غمِ دل کی صدا
لفظ و معنی کو کیا ایک نیا بُعد عطا
مدّعی ہر کوئی آہنگِ غزل خوانی کا
گُلِ نغمہ کو یہ لیکن نَفَسِ بادِ صبا
گرمیٔ جوہرِ اندیشہ، خُورِش ہے اس کا
یہ عقیدہ ہے عَلیٰ وجہِ بصیرت میرا
حکمتِ غم نے تجھے عشق کا عرفاں بخشا
ہے تُو کافر تو کھُلا اور ولی پوشیدہ
سخنِ عشق نہیں رمز و اشارت کے سوا
کہ یہ اک تلخ حقیقت ہے، سہانا سپنا
دل ترا کب ہدفِ ناوکِ مژگاں نہ رہا؟
کرے رسموں سے اِبا مشربِ رندانہ ترا
ہے بیانِ جگرِ سوختہ افسانہ ترا
ہے جُدا سب سے دروبست میں پیمانہ ترا
رُودکشِ محفلِ جانانہ ہے ویرانہ ترا
فاقہ مستی میں بھی انداز ہے شاہانہ ترا
باعث اس کا ہوسِ لذّتِ آزار بھی ہے
مگر افتادِ طبیعت سے تو لاچار بھی ہے
طلبِ پارچہ و کرسیٔ دربار بھی ہے
شاملِ خیلِ گدایانِ درِ یار بھی ہے
ایک اسلوب ہے اس میں بھی جداگانہ ترا
جلوۂ برق سے روشن ہے سیہ خانہ ترا
خانۂ بے در و دیوار ہے مے خانہ ترا
سوز و مستی سے بھرا رنگِ ظریفانہ ترا
ہے عطا کس کی یہ اندازِ حکیمانہ ترا؟
اور رندانِ قدح کش سے بھی یارانہ ترا
بیش و کم ہر دلِ فرزانہ ہے دیوانہ ترا

فروری ۱۹۸۳ء

غالب

سو سال کے بعد آج کی گفتار ہے غالب ؛ اقلیمِ سخن کا وہی سردار ہے غالب
غالب سے غزل اور غزل سے ہے زمانہ ؛ وسعت کے لئے برسرِ پیکار ہے غالب
اِک شہرِ خموشاں کی فضا چار طرف ہے ؛ ہر اک یہی کہتا ہے کہ بیدار ہے غالب
صدیوں کے لئے ہیئت و اُسلوب کا وجدان ؛ اک فیض کا منبع ہے کہ دربار ہے غالب
دلدادۂ ترسیل معانی کا گلہ کیش ؛ شعروں کی زباں جرأتِ اظہار ہے غالب
دو چار نہیں سینکڑوں عنصر کا پیامی ؛ دیباچۂ تخلیق ہے طومار ہے غالب
اک خالقِ صد پیکرِ الفاظ و معانی ؛ فن جس پہ کرے ناز وہ فنکار ہے غالب
انسان ہے انسان کی عظمت کا امیں ہے ؛ ہر قوم کے انسان کا پندار ہے غالب
اب تک جو کہا ہم نے وہ تصدیق کرے گا ؛ ہر شعر میں اک پرتوِ انوار ہے غالب
ہر شعر کہا جس نے بلا قیدِ زمانہ ؛ ہر عہد کے شاعر کا طرفدار ہے غالب
معنی کے سمندر سے خلاؤں تلک آماج ؛ اے کشتِ ادب ابرِ گہربار ہے غالب
چرچا ہی رہے جس کا سدا روئے زمیں پر ؛ حرفوں کی کہانی کا وہ کردار ہے غالب
گنجینۂ معنی کا طلسم آج بھی سمجھیں! ؛ الفاظ ہیں غالب کے پُراسرار ہے غالب
کونپل کی طرح پھوٹ نکلتے ہیں معانی ؛ ہر شعر میں گنجینۂ اشعار ہے غالب
تعمیر میں مضمر ہے جو، سائنس سے ظاہر ؛ اک رو ہے کہ ایٹم ہے کہ رفتار ہے غالب
بازیچۂ اطفال میں ہر چیز پڑی ہے ؛ یہ کیسا تماشا ہے سردار ہے غالب
سر جس کا جھکا ہی نہیں تنقید کے آگے ؛ پانی ہے مگر کاٹ میں تلوار ہے غالب
کون آگے نکل سکتا ہے اس ذہنِ رسا سے ؛ شوریدہ سروں کیلئے دیوار ہے غالب
ہاں ذہنِ رسا اور بھی کچھ سعیٔ رہائی ؛ الفاظ کے پیکر میں گرفتار ہے غالب

ماجدؔ ہی نہیں اور بھی کچھ لوگ ہیں کہہ دیں
ہم جس کی رعایا ہیں وہ سرکار ہے غالب

خالد احمد

غالبؔ

سحر نگار کون تھا ؟
سحر شکار میں سہی

جتنے بھی فن نورد ہیں ایک ترے ہلاک ہیں
تیرے سخن کی گرد ہیں، تیرے ہنر کی خاک ہیں
تیرے قدم بہر قدم نجم شمال ہو گئے !

تو نے ہمیں یہ حق دیا، دشت کو بحر کہہ سکیں
رات کو رات، دن کو دن، زہر کو زہر کہہ سکیں
تیرے لبوں کے لمس سے لفظ گلال ہو گئے !

سطر بہ سطر، خط بہ خط حرف رہے رکوع میں
ماہِ تمام چھپ گیا مرحلۂ طلوع میں
عصر نگار کون تھا، عصر شکار ہم سہی

شب کی دہائی دیجئے، صبح کے سائے سائے کیوں؟
روئیے زار زار کیا؟ کیجئے ہائے ہائے کیوں؟

غالبؔ اور جدید ذہن

ڈاکٹر وزیر آغا

اس میں کوئی کلام نہیں کہ غالبؔ دراصل بیسویں صدی کا انسان تھا جو غلطی سے انیسویں صدی میں پیدا ہو گیا اور اس بات کی اُسے سزا بھی ملی۔ اُس کی تعلّی کو مہمل، اُس کے اندازِ فکر کو نامانوس اور اُس کے اسلوبِ حیات کو قابلِ اعتراض قرار دیا گیا۔ مگر جب غالبؔ تقریباً ایک سو برس کی مسافت طے کرنے کے بعد اپنوں میں پہنچا تو زمانے نے باہیں کھول کر اُس کا استقبال کیا۔ بعض نے اُس کے دیوان کو الہامی کتابوں میں شامل کرنے کی جسارت کی اور بعض نے اُسے بیسویں صدی کا پیش رو قرار دیا۔ جدید ذہن کا اتنے بڑے پیمانے پر غالبؔ کے کلام سے متاثر ہونا اس وجہ سے تھا کہ دونوں خود کو ایک ہی WAVE — LENGTH پر محسوس کر رہے تھے۔ یعنی جدید دور کے ہر قسم کے RECEIVING SET میں غالب کے دیوان سے نشر ہونے والا مواد بغیر کسی موسمی، سیاسی یا سماجی رکاوٹ کے براہِ راست موصول ہو رہا تھا۔ دیکھنا چاہیئے کہ یہ معجزہ کیسے رونما ہوا؟

جیسا کہ سب جانتے ہیں کہ انسانی ذہن کی تنگی یا فراخی ہمیشہ زمانے کے خاص مزاج کے تابع ہوتی ہے۔ مثلاً جب زمانہ سست روی کا مظاہرہ کرتا ہے

ز روایت مستحکم ہوتی ہے، نظریات زرہ بکتر پہن لیتے ہیں، آداب و قواعد میں سنگلاخیت آجاتی ہے اور فرد ایک پُرزے کی طرح خود کو سماج کی مشین کے ساتھ جُڑا ہوا محسوس کرتا ہے۔ لازم ہے کہ ایسی صورت میں اُس کا دماغ بھی تحفظات کے چھتنار تلے روائتی گل محمد کا کردار ادا کرے۔ سو وہ کرتا ہے۔ چونکہ اُسے خود سوچنے کی ضرورت نہیں پڑتی — اس لئے کہ یہ شُبعہ کام اُس کا سماج سرانجام دے رہا ہوتا ہے لہٰذا اُس کے دماغ کو اپنے سیکرٹیریٹ میں توسیع کرنے کی ضرورت بھی نہیں پڑتی۔ دوسری طرف جب زمانہ قیامت کی چال چل رہا ہو، فاصلے سمٹ رہے ہوں اور تیز رفتاری کے باعث سارے تحفظات تار تار ہو رہے ہوں تو انسانی ذہن کو بھی نئی صورتِ حال سے نپٹنے کے لئے اپنے سیکرٹریٹ کو فوری طور پر کشادہ کرنے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے تاکہ وہ ہر دم بدلتے ہوئے تناظر سے مسلسل اور متواتر آنے والے پیغامات کو وصول کر سکے۔ رفتار کا ایک پہلو اور بھی ہے۔ وہ یہ کہ سست رفتاری کے باعث نظر کے سامنے قدم قدم پر جو رکاوٹیں اُبھر کر انسانی ذہن کی پرواز کو روکتی ہیں، تیز رفتاری کے باعث

باقی نہیں رہتیں اور نظر ناموجود اور نامعلوم کی سرحدوں تک کو چھونے لگتی ہے۔ اس ضمن میں کولن ولسن نے ایک مزیدار مثال دی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ روزمرّہ کی زندگی اُس جنگلے کی طرح ہے جس میں ہر سلاخ کے بعد ایک باریک سی درز ہوتی ہے۔ اگر آپ رک کر اور درز کے ساتھ اپنی آنکھ لگا کر دیکھیں تو آپ کو جنگلے کے دوسری طرف کا ایک محدود سا حصہ ہی نظر آئے گا لیکن اگر آپ سائیکل پر سوار ہو کر تیز رفتاری سے جنگلے کے پاس سے گزریں تو تمام درزیں یکجا ہو جائیں گی اور آپ کو جنگلے کے پار کا پورا منظر دکھائی دے جائے گا۔ مگر رفتار ضروری ہے۔ یہی حال انسانی ذہن کا ہے۔ اگر اُس کی رفتار تیز ہے تو لامحالہ اس کی ادراکی قوت بھی زیادہ ہوگی اور وہ بڑی آسانی سے وہ سب کچھ دیکھ لے گا جسے سماج کی زنگ آلود آہنی سلاخوں نے اُس کی نظروں سے چھپا رکھا تھا۔

جدید ذہن بیسویں صدی کی پیداوار ہے اور بیسویں صدی ایک انتہائی تیز رفتار صدی ہے۔ اگر کوئی آسمانی مخلوق اس کرۂ ارض کو لاکھوں سالہائے نور کے فاصلے سے دیکھ رہی ہو تو وہ حیرت زدہ ہو کر یہ سوچنے پر مجبور ہوگی کہ اس کرۂ ارض کو کیا ہو گیا ہے

کہ یکایک اس کی ساری مخلوق شہد کی مکھیوں کی طرح چاروں طرف اُڑنے لگی ہے اور بعض مکھیاں تو قریبی سیاروں تک پہنچ رہی ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ اس کرۂ ارض پہ آوازوں کا کہرام برپا ہو گیا ہے جیسے کوئی حادثہ ہو گیا ہو۔ سو بیسویں صدی تیز رفتار ہی نہیں انتہائی باتونی صدی بھی ہے۔ ہم سب بیک وقت نہ صرف چاروں طرف دیوانہ وار بھاگ رہے ہیں بلکہ ہمہ وقت زیادہ سے زیادہ بولنے اور اپنی آواز کو بلند سے بلند تر کرنے کی فکر میں بھی ہیں۔ لاؤڈ سپیکر اور ریڈیو سے لے کر جٹ ہوائی جہاز اور پھر جوہری بم تک — آواز کے دائرے پھیلتے ہی چلے گئے ہیں۔ تغیّر اور تبدیلی کی رفتار اس قدر تیز ہے کہ ہر شے چشم زدن میں پرانی دکھائی دینے لگتی ہے۔ چنانچہ ایک THROW AWAY CULTURE نمودار ہو رہا ہے جس میں فیشن گرگٹ کی طرح اپنے رنگ بدلتے ہیں۔ یہ تیز رفتاری بیک وقت تخریبی بھی ہے اور تعمیری بھی — تخریبی یوں کہ اس نے صدیوں پرانے سماجی اور مابعد الطبیعاتی نظام کو لرزہ براندام کر دیا ہے اور اس کی پُر شور اور بے محابا یلغار کے سامنے نظریے سسٹم اور پیٹرن تاش کے پتّوں کی طرح بکھرنے لگے ہیں۔ تعمیری یوں کہ زمین کی تیز رفتاری نے بہت سے پردوں کو نوچ کر پرے پھینک دیا ہے اور انسانی نظریں کائناتِ اکبر اور کائناتِ اصغر دونوں کا مطالعہ کر رہی ہیں۔ فلکیات نے کائنات کو اتنا وسیع کر دیا ہے کہ اس کا ادراک کرنے کی کوشش کریں تو تخیّل کے بھی پر جل اٹھیں۔ حیاتیات کے مطالعہ نے خلیہ کی کوکھ میں ایک کائناتِ اصغر کا منظر دکھایا ہے بلکہ RECOMBINENT D.N.A. یا GENE-SPLICING سے تخلیق کاری کا ایک نیا باب کھول دیا ہے۔ نفسیات نے انسانی ذہن کے اعماق میں اتر کر نہ صرف اس کے پورے ماضی کو طشت ازبام کرنے کی کوشش کی ہے بلکہ شخصیت کے ٹوٹے ہوئے اعضا کو جوڑنے کی طرف بھی ایک قدم اٹھایا ہے۔ ان سب کے نتیجے میں انسان کو ایک نیا وژن مل رہا ہے۔ گویا تیز رفتاری کے باعث نظروں کے سامنے پھیلے ہوئے جنگلے کی درزیں یکجا ہو کر ایک کھڑکی سی بن گئی ہیں اور اس کھڑکی میں سے انسان کو ایک نیا جہاں طلوع ہوتا ہوا دکھائی دینے لگا ہے۔ جدید ذہن بیک وقت پرانے جہان کے انہدام کا تماشائی بھی ہے اور ابھرتے ہوئے نئے جہان کا ناظر بھی۔ وہ رفتار سے لیس بھی ہے اور تغیر سے آشنا بھی۔ وہ انبوہ سے کٹ کر اپنی انفرادیت کو بھی نکھار رہا ہے اور تخلیقی طور پر فعّال ہونے کے باعث اپنے اجتماعی روپ کو پہچاننے پر بھی قادر ہے۔ لہٰذا اُسے سیرابی کا احساس بھی ایسی شاعری کے مطالعہ ہی سے ہو سکتا ہے جس میں اس کا سارا تناظر منعکس ہو رہا ہو۔ غالب کی شاعری جدید ذہن کو اسی لئے عزیز ہے کہ اس میں اُسے اپنی یافت اور نایافت، انفرادیت اور اجتماعیت، ذہنی فعالیت اور تخلیقی اُپج ایک ایسے احساسِ بحر آسا پر منتج ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے جو بعض اوقات تو کائناتی شعور کے مقام تک بھی جا پہنچا ہے۔

جدید ذہن دو دنیاؤں کا سنگم ہے۔ ان میں سے ایک دُنیا تو وہ ہے جو دم بدم بلکہ پل پل تبدیل ہو رہی ہے۔ جس میں شکست و ریخت کا عمل اس قدر تیز ہے کہ اشیا اور مظاہر کے علاوہ سماجی ڈھانچے اور فکر و نظر کی عمارتیں بھی مسمار ہو رہی ہیں۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے اپنی شاعری میں اسے ایک ویرانہ یا WASTELAND کہہ کر پکارا ہے جب کہ جدید اُردو شاعری میں اسے صحرا یا برف زار کے روپ میں دیکھا گیا ہے۔ مغرب کے تینوں بڑے فلسفی تاریخ دانوں (یعنی شپنگلر، ٹائن بی اور سوروکن) نے اسے زوالِ مغرب سے موسوم کیا ہے۔ اور یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ انسان کی ساری تہذیبی یافت اب اُس حیوان کی زد میں ہے جو انسان کے بطون میں کہیں چھپا بیٹھا تھا۔ غالب کے زمانے میں جب سماجی ڈھانچے محفوظ، گھر سلامت، خاندان برقرار اور ذہنی رفتار کم تھی تو شاعری میں کسی ویسٹ لینڈ کے آثار کا نظر آنا قرینِ قیاس نہیں تھا۔ بیشک ہمارے بعض شعرا نے دلّی کے اجڑنے کا ذکر کیا تھا مگر ایک پوری دُنیا کے انہدام کا منظر اُن کی نظروں سے اوجھل تھا۔ غالب وہ واحد شخص تھا جس نے انیسویں صدی کا باسی ہونے کے باوجود بیسویں صدی کے ویسٹ لینڈ کے ابھرتے ہوئے سایوں کو دیکھا اور پھر اس کربناک صورتِ حال کو اپنے اشعار میں سموتا چلا گیا ؎

اب میں ہوں اور ماتمِ یک شہرِ آرزو
توڑا جو تُو نے آئینہ تمثال دار تھا

گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا
بحر گر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا

رَو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھئے تھمے
نے ہاتھ باگ پہ ہے نہ پا ہے رکاب میں

نہ گُلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز

شکست کی آواز شخصی بھی ہوتی ہے اور اجتماعی بھی!

ہر زمانے میں ہر اچھے شاعر کے ہاں ذاتی سطح کا المیہ کسی نہ کسی حد تک ضرور ابھرا ہے۔ اور اس المیے کی جلو میں ویرانی اور بے سروسامانی کے مناظر بھی سامنے آئے ہیں مگر کم شعرا کے ہاں اجتماعی سطح کی شکست و ریخت کا احساس نمودار ہوا ہے۔ غالب اپنے معاصرین سے اس اعتبار سے بھی مختلف ہے کہ اُس کا غم ذات کے اُس دیار سے آیا ہے جو اجتماعیت کا گہوارہ ہے اور جس میں پوری نسلِ انسانی کے اندیشے اور امیدیں محوِ خواب ہیں۔ جدید ذہن کا امتیازی وصف بھی یہی ہے کہ وہ ذات کے اجتماعی رُخ سے متعارف ہو رہا ہے۔

مگر جیسا کہ میں نے کہا بیسویں صدی محض ٹوٹنے اور ریزہ ریزہ ہونے کا منظر نہیں دکھا رہی بلکہ اس کی تخریب میں تعمیر کی ایک صورت بھی مضمر ہے۔ تخلیق کاری میں بھی جب ایک سطح ٹوٹتی ہے تو اس کے نیچے سے ایک نئی اور شفاف سطح برآمد ہو جاتی ہے۔ بیسویں صدی کا ذہن اس نئی اجتماعی شیرازہ بندی کا ناظر ہے اور غالب کے ہاں بھی جدید ذہن کا یہ خاص انداز صاف نظر آتا ہے ؎

ہوں گرمیٔ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ ہوں

غالب کے ہاں آمدِ فصلِ بہار کا عرفان اور گلشنِ نا آفریدہ کی جھلک اس بات پر دال ہے کہ بے پناہ اندھیروں کے باوجود غالب اُس حقیقت کے لمس سے آشنا تھا جو آہستہ آہستہ طلوع ہو رہی تھی مگر جسے اُس کے معاصرین کی آنکھیں دیکھنے سے قاصر تھیں۔ چونکہ بیسویں صدی کا ذہن شکست و ریخت کی اُڑتی ہوئی گرد میں سے آنے والے زمانے کی ایک جھلک پانے پر قادر ہو گیا ہے اس لئے جب اُسے گلشنِ نا آفریدہ کے ہونے کا احساس شعر کی صورت میں گُدگداتا ہے (جیسا کہ غالب کے اشعار میں) تو اُسے قدرتی طور پر سیرابی کا احساس بھی زیادہ ہوتا ہے جدید دور میں غالب کی مقبولیت کی ایک اہم وجہ یہی ہے کہ اُس کے اشعار آج کے قاری کی احساسی طلب کو پورا کرتے ہیں اور دم بدم پھیلتے ہوئے آفاق میں نہ صرف اُس کا ساتھ دیتے ہیں بلکہ اُسے آنے والے زمانے کو پہچاننے اور پھر اُس تک پہنچنے پر مائل بھی کرتے ہیں۔ جدید دور سے قبل کا کوئی بھی دوسرا شاعر آج کے ذہن کو اس انداز میں تسکین بہم نہیں کر سکا۔

بیسویں صدی، جیسا کہ آپ جانتے ہیں، سیاسی اعتبار سے ایک نہایت فعال صدی ہے۔ اس میں کاغذی سکوں سے بھی زیادہ کاغذ کے اُس پُرزے کو اہمیت حاصل ہے جسے اخبار کا نام ملا ہے۔ اخبار کا کام یہ ہے کہ آپ چاہیں یا نہ چاہیں وہ ہر صبح سارا دنیا کو آپ کی دہلیز پر لا کھڑا کرتا ہے — یوں کہ دُنیا کے بعید ترین گوشوں میں بھی کوئی واقعہ رونما ہو تو اس کی دستک آپ کو اپنے گھر کے دروازے پر محسوس ہوتی ہے۔ بیسویں صدی کا فرد جملہ قومی وابستگیوں کے باوجود اپنی بین الاقوامی حیثیت میں نمودار ہو رہا ہے۔ اب اُسے "دنیا کا شہری" WORLD CITIZEN کہنا شاید زیادہ موزوں ہو۔ یہ شہری انتہائی حساس، باخبر اور پلک جھپکنے میں بات کی تہہ تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ چونکہ آج کا شاعر بھی بیسویں صدی کا باسی ہے لہٰذا اب اُس کی شاعری میں بھی روحِ عصر کروٹیں لیتی ہوئی صاف نظر آتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ آج کا قاری بھی اس نئے شعور کی ہلکی سے ہلکی کروٹ کو گرفت میں لینے پر قادر ہے۔ عام مشاہدہ کی بات ہے کہ مشاعرہ میں وہی شعر سب سے پہلے اور سب سے زیادہ مقبول ہوتا ہے جو بین السطور بعض سیاسی یا سماجی گروہوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ کہنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ جدید شاعری سیاست زدہ ہے بلکہ صرف یہ کہ اس میں جو ذہن اپنا اظہار کرتا ہے وہ روحِ عصر سے آشنا ہوتا ہے۔ نتیجتاً شعر میں ایک ایسی سطح پیدا ہو جاتی ہے جو بیک وقت فرد اور معاشرے کی جملہ لہروں کو منعکس کر رہی ہوتی ہے۔ بیسویں صدی کے اس خاص رویے کا ذکر یوں ہوا کہ غالب کے ہاں انیسویں صدی کا باسی ہونے کے باوجود یہ رویہ نمودار ہو گیا تھا۔ بے شک انیسویں صدی میں بھی سیاسی سطح کے متعدد واقعات رونما ہوئے اور ان واقعات کی تشہیر کے لئے بعض اخبارات نے بھی جنم لیا۔ لیکن وہ شے جسے "سیاسی شعور" کا نام دینا چاہیے، یا وہ احساس جو "دنیا کا شہری" ہونے سے جنم لیتا ہے غالب کے زمانے میں کہیں نظر نہیں آتا۔ خود غالب کی عام زندگی میں بھی انگریزی عملداری سے بغاوت یا بادشاہت کے تصور سے انحراف کے شواہد دکھائی نہیں دیتے۔ اس سب کے باوجود جب غالب کے اشعار کو پڑھا جائے تو قاری کو فوراً احساس ہوتا ہے کہ وہ انیسویں صدی کے وسط میں رہنے والے کسی شخص کا کلام نہیں پڑھ رہا بلکہ بیسویں صدی کے ایک حساس اور باشعور فرد سے متعارف ہو رہا ہے مثلاً

کیا کیا خضر نے سکندر سے
اب کسے رہنما کرے کوئی

کچھ تو دے اے فلکِ ناانصاف
آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

زمانہ عہد میں اُس کے ہے محوِ آرائش
بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لئے

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

اپنے مزاج اور لہجے کے اعتبار سے غالب کے یہ اشعار بیسویں صدی کے اشعار ہیں اور آج کے قاری کو پوری طرح مطمئن کرتے ہیں، بلکہ بعض اوقات تو یوں لگتا ہے جیسے ساری جدید غزل غالب کے لہجہ، جہت اور مزاج سے متاثر ہے اور اس آج کی غزل میں رہبر، رہزن، سایا، جنوں، قلم، خنجر اور خون وغیرہ الفاظ کے نئے علامتی مفاہیم براہِ راست غالب سے آئے ہیں مثلاً فیض کے کلام کو لیجئے جو کہ سیاسی شعور کے لئے بہت مشہور ہیں۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ فیض کس حد تک غالب سے متاثر ہیں۔ اس بات سے قطع نظر کہ ان کے دو مجموعوں یعنی "نقشِ فریادی" اور "دستِ تہِ سنگ" کے نام تک غالب سے مستعار ہیں، اپنے متعدد اشعار میں بھی فیض نے غالب سے استفادہ کیا۔ مثلاً فیض کا ایک مصرعہ ہے ؏

اور بھی دُکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا

اور غالب کا مصرعہ ہے ؏

تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

اسی طرح فیض لکھتے ہیں ؏

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں ہم نے

اور غالب کا شعر ہے ؏

درد دل لکھوں کب تک جاؤں اُن کو دکھلاؤں
انگلیاں فگار اپنی خامہ خونچکاں اپنا

مقصود غالب اور فیض کا تقابل ہرگز نہیں بلکہ محض اس بات کا اظہار ہے کہ غالب کے کلام میں ایک ایسا ذہن کارفرما نظر آتا ہے جو بیسویں صدی کے ذہن کا پیش رو کہلا سکتا ہے۔ غالب سیاسی معاملات میں نہیں سماجی معاملات میں بھی خاصا باشعور ہے اور فکر کے اعتبار سے تو وہ بیسویں صدی سے ایک بڑی حد تک ہم آہنگ ہے ؏

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

... دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل
کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

مگر غالب کا روحِ عصر سے متاثر ہونا اس بات پر دال ہرگز نہیں کہ وہ اجتماع کا تابع مہمل ہے دراصل اجتماعیت کے بھی دو پہلو ہیں — ایک یہ کہ فرد انبوہ کا جزو بن جائے۔ ایسی صورت میں گلے کی وہ ذہنیت جنم لیتی ہے جس کا نطشے نے انتہائی حقارت سے ذکر کیا ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ فرد اپنی ذات میں مضمر اجتماعیت کا عرفان حاصل کرے اور یوں انبوہ سے اوپر اٹھ کر اپنی انفرادیت کا احساس دلائے۔ صوفیا کے ہاں انفرادیت کا یہ لمحہ ذاتِ کل سے انسلاک کا لمحہ ہے۔ یعنی وہ لمحہ جب جزو کو اپنی اجتماعیت کا عرفان حاصل ہوتا ہے۔ مگر غالب صوفی نہیں ہے۔ غالب کی انفرادیت ایک تخلیق کار کی انفرادیت ہے یعنی وہ اجتماعیت کو مَس تو کرتا ہے مگر اس میں ضم نہیں ہوتا۔ اُسے کسی بھی قسم کی دبا میں مرنا پسند نہیں۔ زندگی کا معاملہ ہو یا موت کا، غالب کا اسلوب اور رویہ دوسروں سے الگ اور جُدا ہے۔ یہی تخلیقی انفرادیت بیسویں صدی کا ثمرِ شیریں بھی ہے جس کا فنون کے علاوہ زندگی کے دوسرے شعبوں میں مظاہرہ اب بڑے پیمانے پر ہونے لگا ہے۔ غالب کے ہاں اثباتِ ذات کا اظہار کچھ یوں ہوا ہے ؏

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لئے

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
مانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

ایک خاص بات جو غالب کو اپنے زمانے سے بلند اور جدید ذہن سے قریب تر کرتی ہے اُس کی حسِ مزاح ہے۔ مزاح غالب کے دور میں بھی تھا لیکن اس نے زیادہ تر پھکڑ پن، ہجو، طعن و تعریض یا لفظی بازی گری میں خود کو نمایاں کیا تھا اور وہ شے جسے ہنسی کے سلسلے میں پروفیسر حمید احمد خان نے "لطافت اور پاکیزگی اور صفائے باطن، ہمہ بینی، ہمہ دانی اور ہمہ رنگی کی شان" کہا ہے غالب کے زمانے میں ابھی ابھر نہیں سکی تھی۔ ویسے بھی ہمارے ادب بلکہ پورے معاشرے میں ہنسنے ہنسانے کا خانہ بالکل الگ رہا ہے۔ قدیم اُردو غزل ہی کو دیکھئے جس میں سنجیدہ اشعار کے عین درمیان زاہد یا شیخ کی شان میں آپ کو ایک آدھ ایسا طنزیہ

شعر ضرور مل جائے گا جو پوری غزل کے مزاج سے قطعاً مختلف ہوگا۔ اسی طرح ہماری بیشتر فلموں میں مزاحیہ سین پوری فلم سے بالکل الگ دکھائی دیتے ہیں۔ اس چھوٹ چھات کے ہنسی کی نوعیت پر بھی اثرات مرتسم ہوئے ہیں۔ چنانچہ ہمارے ہاں صدیوں کے معاشرتی عمل سے زیادہ تر خندہ دنداں نما کو تحریک ملی مگر وہ شے جسے نفسی انبساط کا نام ملنا چاہیئے اور جو عام گفتگو میں ایک نورانی لہر کی طرح سرایت کرتی ہے، ہمارے ہاں پوری طرح ابھر نہیں پائی۔ البتہ بیسویں صدی میں اُس زیرِ لب مسکراہٹ کے آثار جابجا نظر آرہے ہیں جو بعض اوقات ہلکی سی اداسی میں گھل کر ایک عجیب سی لطافت اور رفعت کا مظاہرہ کرتی ہے اور جملہ فنونِ لطیفہ کے علاوہ عام گفتگو اور سوچ کے عام انداز میں بھی دکھائی دینے لگی ہے۔ مثلاً کائنات کی پُراسراریت کو بڑی شدت سے محسوس کرتے ہوئے ایک مشہور سائنس دان نے ایک بار کہا تھا:

THE UNIVERSE IS LIKE A GRIN ON THE FACE OF A CAT WHILE THE CAT IS NOT THERE.

اور یوں مزاح میں ہمہ بینی، ہمہ دانی اور ہمہ رنگی کی ایک خوبصورت مثال پیش کردی تھی۔ اُردو کے شعرا میں غالبؔ وہ واحد شاعر ہے جس کے ہاں مزاح کی یہ لطیف کیفیت اپنی ساری تازگی اور سرشاری کے ساتھ اُبھری ہے اور بیسویں صدی کے ذہن کو اشیاء اور مظاہر کی مضحک کیفیات کا احساس دلانے میں کامیاب ہوتی ہے۔ غالبؔ کا کمال یہ ہے کہ اُس نے اپنی انفرادیت کا بھرپور اظہار یوں کیا کہ اپنی ذات کو نشانۂ تمسخر بناکر اور اپنے جذباتی افعال پر مسکرانے کی روش اختیار کرکے خود کو ذات کے حصار سے باہر نکال لیا اور یوں اُس کشادہ نظری کا مظاہرہ کیا جس کا چلن بیسویں صدی میں روز بروز عام ہو رہا ہے۔

آخر میں مجھے یہ کہنا ہے کہ جدید ذہن پھیلتے ہوئے علوم کی وساطت سے کائنات کی ایک ایسی نئی سطح سے آشنا ہو رہا ہے جس کی کوئی نہایت نہیں ہے۔ ریڈیو دوربین کائنات کی آخری قوس پر روشنی کی رفتار سے ذرا کم رفتار پر باہر کی طرف جاتے ہوئے QUASERS کا احساس دلائے یا خوردبین پروٹوپلازم کے بطون میں اُتر کر GENE کی کائنات کو طشت از بام کرے اور ذرّے کے اعماق میں الیکٹرونز اور پروٹونز کی بے نہایت دُنیا کا منظر دکھائے یا علوم سائکی کے خزائن کو منظرِ عام پر لائیں یا فنون انسانی روح کے متعدد ابعاد کو منکشف کریں، نتیجہ ایک ایسے "ذہن" کی صورت ہی میں اُبھرتا ہے جو بیسویں صدی کا وصفِ خاص ہے اور جسے کائناتی شعور COSMIC CONSCIOUS-NESS کا نام دیا جاسکتا ہے۔ غالبؔ کے زمانے میں بیسویں صدی کا یہ ذہن ابھی نمودار نہیں ہوا تھا مگر حیرت کی بات ہے کہ غالبؔ کے ہاں ایک ایسا زاویۂ نگاہ اُبھر آیا جسے اس ذہن کا پیش رو قرار دیا جاسکتا ہے۔ غالبؔ جب کہتا ہے کہ ؎

ہے کہاں تمنّا کا دوسرا قدم یا رب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

تو انسان یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ دیوتا نے تو تین قدموں میں پوری کائنات کا احاطہ کیا تھا مگر غالبؔ کیسا ذی روح ہے کہ اُس نے اپنا پہلا قدم تو دشتِ امکاں پر رکھا ہے اور دوسرا قدم رکھنے کے لیے اسے کوئی جگہ ہی نہیں مل رہی!

غالبِ خستہ کے بغیر![1]

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار

عصرِ رواں کا سلسلہ دراز ہے۔ لمحے ساعتوں میں، ساعت دنوں میں، دن مہینوں میں اور ماہ و سال صدیوں میں ڈھلتے جاتے ہیں۔ زمانے کی اس تند و سبک سیر رَو میں کچھ شخصی اور تہذیبی نقوش ایسے ہوتے ہیں جو تاریخ ہی کا حصہ نہیں بن جاتے بلکہ آفاقی فکر و احساس کی لہروں سے مل کر حیاتِ جاوداں کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں۔ مرزا اسد اللہ خاں غالب کی شخصیت اور اُن کا فن بھی انہی ادبی و تہذیبی نقوش میں شامل ہے وہ ہماری ادبی تاریخ ہی کا ایک اہم کردار نہیں بلکہ اُن کا کلامِ بلاغت نظام آج بھی دلوں کو گرماتا اور روحوں کو تڑپاتا ہے اور یقین ہے کہ وقت کے گزرنے کے ساتھ اس کی تاثیر میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ غالب کو رحلت کیے اب ایک سو چودہ سال ہو گئے ہیں۔ زمانے کی تقویم بیکراں میں تو سو، سوا سو سال کا عرصہ ایک لمحے ہی کی حیثیت رکھتا ہے مگر افراد کی حیات و ممات میں اتنا عرصہ بھی فیصلہ کُن ہوتا ہے۔ غالبؔ کے زمانے کی بہت سی سربرآوردہ ہستیاں آج قصۂ پارینہ کی نذر ہو چکی ہیں مگر اپنے زمانے میں ناقدری کا شکار غالب پہلے سے زیادہ زندہ و تابندہ ہے اور اُس کے فکر و فن کا مطالعہ مختلف جہتوں سے ہو رہا ہے۔ کائنات کی ہر شے متحرک، رواں دواں، عروج و زوال کی بلندیوں اور پستیوں سے دوچار ہے۔ غالب کو اس انقلابِ دوراں کا پورا احساس تھا:

> ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام
> مہرِ گردوں ہے چراغِ رہگزارِ بادیاں

افراد اور اقوام سب اس آئینۂ ایام میں اپنی اپنی جلوہ گری دکھا کر اپنی منزلِ مراد کو جا لیتی ہیں۔ فکرِ فردا سے بے پروا افراد اور تاریخِ امم سے بے خبر اقوام اپنے انجام کو جلد پہنچ جاتے ہیں۔ مگر با شعور افراد اور عاقبت اندیش اقوام عیشِ امروز میں غرق ہونے کی بجائے اپنے دوش و فردا کا محاسبہ کرتی اور زندہ رہتی ہیں۔ غالبؔ کے ہاں ترکانہ ورثے میں عیشِ امروز کا احساس بہ شدت موجود ہے مگر وہ اس میں اپنے شعور و آگہی کی بدولت ڈوبتے نہیں۔ اُن کی بے پناہ حسِ ادراک اپنے گرد و پیش کے بدلتے ہوئے حالات کا عقلی تجزیہ قدم قدم پر کرتی ہے اور انہیں ردّ و قبول کی راہیں سجھاتی ہیں۔

زمانے کی تند و سبک سیر رَو میں تنکوں کی طرح بہتے ہوئے ذکی الحس افراد کی طرح غالبؔ کو بھی اپنے نیست و نابود ہو جانے کا احساس ستاتا ہوگا، اور وہ مہذب انسان کے اس مقسوم پر خالقِ حقیقی سے شکایت آمیز اور درد انگیز لہجے میں یہ کہنے پر مجبور ہوئے ہوں گے:

---

[1] عنوانِ تحریر غالبؔ ہی کے ایک شعر سے ماخوذ ہے اور حسبِ حال بھی:

> غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں؟
> روئیے زار زار کیا، کیجئے ہائے ہائے کیوں!

یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لئے

لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرّر نہیں ہوں میں

حیاتِ غالب کی گرہیں کھولنے والوں نے اُن کی زندگی کے ایک ایک گوشے کو بے نقاب کرنے کی سعیٔ بلیغ کی ہے۔ مگر مغل عہد کی عالیشان عمارتوں کی طرح غالبؔ کی ہشت پہلو شخصیت بہت کچھ بے نقاب ہونے کے بعد بھی اپنے کئی پہلوؤں اور گوشوں کو پردۂ راز میں رکھے ہوئے ہے اور شاید اسی اسرار و اخفا ہی میں اُس کی دلکشی پنہاں ہے۔ جس شخص کی آرزوؤں اور خواہشوں کی وسعت میرابی اور پھر بھی تشنہ لبی کا یہ عالم ہو کہ:

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے

بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

اور پھر جس شخص کا تصوّرِ حسن و جمال بھی اتنا بے کراں ہو کر:

سب کہاں، کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں

خاک میں، کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

اور جو اپنے احساسِ گناہ کے سلسلے میں ناکردہ گناہوں کی حسرت و خلش کے لئے بھی داورِ محشر سے دادخواہ ہو:

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد

یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

ایسے شخص کے کردار اور قول و فعل کو بندھے ٹکے روایتی پیمانوں سے کیونکر جانچا جا سکتا ہے؟ ایسا شخص مقلد نہیں ہوتا مجتہد ہوتا ہے۔ وہ روایت سے بغاوت تو نہیں کرتا مگر اپنی وسیع جولانگاہِ خیال اور اپنی بے پناہ قوتِ تخلیق سے وہ کہنہ روایات کا رُخ نئی سمت کی طرف موڑ دینے پر قادر ہوتا ہے۔ غالبؔ، فارسی اور اُردو کی ہزار سالہ شعری تہذیبی روایت میں ایک ایسا ہی مجتہد ہے جس نے اقلیمِ عشق، اقلیمِ فکر اور اقلیمِ فن کی محکم روایات سے بھرپور استفادہ کیا، مگر وہ ان کا اسیر نہیں ہوا۔ اس نے بندھے ٹکے اصولوں، ضابطوں، اور نظریوں سے انحراف بھی کیا اور ایک حقیقی رومان پسند مفکر، شاعر اور ادیب کی طرح وہ نئے انفس و آفاق کی جستجو میں مستانہ وار رہِ وادیٔ خیال طے کرتا چلا گیا:

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود

قبلے کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

مستانہ طے کروں ہوں رہِ وادیٔ خیال

تا، بازگشت سے نہ رہے مُدعا مجھے

اقلیمِ عشق میں غالبؔ کی اَنا روایت کے طلسم کو متعدد پہلوؤں سے توڑتی اور نئے امکانات کی جستجو اور نئے رویوں کا اظہار کرتی نظر آتی ہے۔ اس کی ایک واضح مثال ان کے ہاں فارسی، اُردو کی شعری روایت کے مسلّمہ ہیروز کے تذکرے کے سلسلے میں ملتی ہے جن کا ذکر وہ اس طور پر کرتے ہیں جس میں وہ کچھ نہ کچھ ان مشاہیر کی تحقیر اور بے وقری کا پہلو نکلتا ہے، یہ بت شکنی نئی جہتوں کی دریافت اور اپنی عاشقانہ عظمت کے اظہار کی ایک انوکھی صورت ہے۔ قیس کوہکن منصور وغیرہ اقلیمِ عشق کے ناموروں کا تذکرہ غالب کے شعروں میں جہاں کہیں بھی آیا ہے۔ وہاں کم و بیش یہی انداز ملتا ہے، یعنی اپنی برتری اور ان مشاہیرِ عشّاق کی کہتری کا پہلو۔ چند شعروں میں یہ صورتِ احوال ملاحظہ کیجئے:

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن

ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیٔ منصور نہیں

عشق و مزدوریٔ عشرت گہِ خسرو کیا خوب

ہم کو تسلیم نکو نامیٔ فرہاد نہیں

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن، اسدؔ!

سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

قد و گیسو میں قیس و کوہکن کی آزمائش ہے

جہاں ہم ہیں، وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

دیکھئے پہلے تینوں شعروں میں منصور اور فرہاد کی عظمت کو چیلنج کرتے ہوئے ان کی تحقیر کا کوئی نہ کوئی پہلو نکالا گیا ہے اور آخری شعر میں تو واضح طور پر قیس و کوہکن کو عام عشاق قرار دیتے ہوئے جانبازی کے نقطۂ نظر سے اپنی برتری کا دعویٰ کر دیا گیا ہے۔ انسانی فکر و عمل کی امکانی وسعتوں کے لحاظ سے یہ روایت شکنی قابلِ قدر ہے۔

مگر غالب کے روایت پرست معاصرین اس کے فکری و فنی اجتہاد کو قدر کی نگاہوں سے نہ دیکھ سکے، بعض معاصرین نے تو انہیں بے ربط اور مہمل گو تک بھی کہہ ڈالا۔ غالب اپنے زمانے کی اس ناقدری کے شاکی تھے۔ وہ جہاں مہمل گوئی کے اس الزام کے جواب میں بڑی بے نیازی سے یہ منفی انداز اختیار کرتے ہیں:

نہ ستائش کی تمنا، نہ صلے کی پروا

گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

وہاں مثبت انداز میں اپنے نکتہ چینیوں کی لفظی موشگافیوں کا فنِ شعر اور ذوقِ سخن کے اس حقیقی نظریے کے حوالے سے مُسکت جواب دیتے ہیں،

حسن فروغِ شمعِ سخن دور ہے اسدؔ
پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

یہ تو خیر، غالب کے بعض روایت پرست معاصرین کی تنگ دلی اور کوتاہ نظری تھی کہ وہ اُن کے شعری اجتہاد کا کماحقہٗ اعتراف نہ کر سکے ورنہ غالب کو غالب بنانے میں اس عہد کا بھی خاصہ حصہ ہے، جو دو تہذیبوں کے تصادم کا دلخراش منظر پیش کر رہا تھا۔ ایک طرف قدیم تہذیب کے خوش نما کاخ و ایوان تھے جو برصغیر میں صدیوں کے تہذیبی عمل اور اسلامی اثرات کا نتیجہ تھے مگر گذشتہ ایک صدی میں زوال و انحطاط کی آندھیوں نے انہیں بیخ و بُن سے ہلا دیا تھا۔ دوسری طرف انگریزی راج کے ساتھ مغربی تہذیب کے زنگار رنگ ہنگامے جنّت نگاہ و فردوسِ گوش تھی کا منظر بن کر بسے ہوئے تھے، مگر ان کا عقلی رویّہ انہیں نئے دور کی ترقیات اور تبدیلیوں کو خوش آمدید کہنے پر مجبور کر رہا تھا۔ دل اور دماغ کی یہ کشمکش ذاتی اور اجتماعی درد و غم سے مل کر غالبؔ کے فکر و فن میں ایک پُر تاثیر تہذیبی مرقع بن جاتی ہے جسے بغور دیکھیں تو اس میں اس عہد کی داستانِ دلگداز کے خط و خال ملیں گے جنہیں شاعر کے اشکِ خوں نے رنگیں بنایا ہے:

جو ئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں

۱۸۵۷ء کے المیۂ خوں فشاں میں شہرِ دہلی کا ذرہ ذرہ، جسے مسلمانوں نے اپنے عہدِ عروج میں ستاروں کی چمک دی تھی اُن کے لہو کا پیاسا بن جاتا ہے تو غالب کا دل خون ہو جاتا ہے۔ اور یہ لہو اُس کی آنکھوں سے ٹپک کر اس شعر میں ڈھل جاتا ہے:

شہرِ دہلی کا ذرہ ذرۂ خاک
تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا

غالبؔ کا کیا پتہ تھا کہ جور و ستم کی داستانِ خونچکاں نوّے سال بعد پھر دہلی کے کوچہ و بازار میں دُہرائی جائے گی، اور اُن کا یہی شعر ایک بار ان کے دیدۂ خونبار کا ترجمان بن جائے گا!

بہرکیف، انیسویں صدی کے نصفِ اوّل کے نشیب و فراز غالب کی نگاہوں کے سامنے گزرے اور ۱۸۵۷ء کے قلزمِ خوں کے تو وہ خود ایک شناور تھے۔ دلّی کی بربادی اور مسلمانوں کے قتلِ عام اور مسلسل دار و گیر کے بعد بھی وہ اپنی قوم کے تہذیبی مرقد کے نوحہ خواں بن کر ۱۸۶۹ء تک جیتے رہے اور اپنے ہی اس شعر کی تمثال بنے رہے:

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

۱۸۵۷ء سے قبل مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ کی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار زیادہ تر شاعری میں ہوا، فارسی میں بھی اور اُردو میں بھی۔ غالب کی غزل فکر اور فن کے لحاظ سے اُس حسین و جمیل تہذیب کا آخری مرقع ہے جو اپنے عہدِ عروج میں تاج محل، جامع مسجد، بادشاہی مسجد اور لال قلعے کی صورت میں ڈھل کر دنیا کے سامنے آئی اور عجوبۂ روزگار کہلائی۔ غالب کے زمانے میں یہ تہذیب آرزوؤں اور تمناؤں کے خیالی تاج محل ہی پیش کر سکتی تھی۔ حقیقی اور مادّی تاج محل، مسجدیں، قلعے اور شالیمار بنانے کے وسائل غالب، بہادر شاہ ظفر اور اُن کی قوم کی دسترس سے باہر جا چکے تھے۔ یہ فکر انگیز دور آرزو اور شکستِ آرزو کی کشاکش سے عبارت تھا، اور مرزا غالب کو قدرت نے اس کے خوش نوا ترجمان کے طور پر قبول کر لیا تھا۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ مغلیہ تہذیب نے دم توڑنے سے قبل اپنی داستانِ عروج و زوال کی فکر انگیز مرقع کشی کے لئے مرزا غالب کو منتخب کر لیا تھا:

نہ گُلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز

طبع ہے مشتاق لذت ہائے حسرت کیا کروں
آرزو سے ہے شکستِ آرزو مطلب مجھے

غالب کی ایک مشہور اور بحث طلب قطعہ بند غزل ہے جس کے مقطعے میں وہ کہتے ہیں:

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالبؔ صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

بعض لوگوں کے نزدیک یہ غزل واقعہ انقلاب ۱۸۵۷ء سے متاثر ہو کر کہی گئی۔ یہ بات درست نہیں۔ یہ غزل تو اس واقعے سے بہت پہلے کی ہے لیکن اس کے بھرپور ایمائی انداز میں یہ تہذیبی المیہ (جس کا ڈراپ سین ۱۸۵۷ء کا واقعہ تھا) پوری

طرح نکھر کر سامنے آگیا ہے۔ شاعر کی چھٹی، ساتویں اور آٹھویں حس (یا وجدان) بعض اوقات اُس سے ایسے ایسے اشعار بھی کہلوا دیتی ہے جو تنہا اُس کے شعور یا لاشعور کا حصہ نہیں ہوتے بلکہ ان میں اُس کے عہد کی روحِ عصر کارفرما ہوتی ہے۔ یہ شعر کسی ایک واقعے سے متعلق نہیں کہا جا سکتا، بلکہ سلسلۂ واقعات کا ردِّ عمل معلوم ہوتا ہے:

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

غور فرمائیے، کیا یہ وہی تہذیبی مجلس نہیں جس کے زندہ ہنگامے ایک ایک کر کے تہہِ خاک سو چلے گئے اور بزمِ آخر کی شمعِ فروزاں اور اس کے ساتھ ہی شاعر کا دلِ سوزاں اُس کے جل بجھنے اور مٹ جانے کا فکر انگیز نوحہ خواں بن کر ہمارے سامنے آ رہا ہے:

ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد یہی فلسفی غالب اپنے اُردو مکاتیب میں کبھی دلّی کی بہاروں کے لُٹنے کا ماتم کرتا ہے، کبھی مسلمانوں کی گذشتہ عظمت و حشمت کا حسرت بھرے انداز میں تذکرہ کرتا ہے۔ کبھی اشکِ غم بہا کر اور کبھی ضبطِ غم کر کے آنسوؤں اور آہوں کو مسکراہٹوں میں بدلنے کی کوشش میں لطیفوں اور نکتہ آفرینیوں کی پھلجھڑیاں چھوڑتا، اور اپنا غم غلط کرتا اور احباب کو بھی خوش دلی سے جینے کا سلیقہ سکھاتا ہے۔ غم و الم کے ماحول میں زندہ دلی کا یہ حوصلہ پیدا کرنا غالب جیسے ہی عظیم فن کار کا فیضان ہے۔ ورنہ اہلِ نظر جانتے ہیں کہ غالب کی اس شوخی، بذلہ سنجی اور خوش طبعی کے سوتے بھی دراصل اُسی تہذیبی المیے سے پھوٹتے ہیں جس کا وہ زندگی بھر فکر انگیز مرثیہ خواں بنا رہا:

دل لگی کی آرزو بے چین رکھتی ہے ہمیں
ورنہ یاں بے رونقی سُودِ چراغِ کشتہ ہے

"غالبیات" : ایک مُستقل شعبۂ ادب

ڈاکٹر سید مُعین الرحمٰن

۱۹۶۹ء میں غالب کی پہلی صد سالہ برسی اہتمام سے منائی گئی ـــ ۱۹۷۰ء سے گویا مُطالعۂ غالب کی دوسری صدی کا آغاز ہوتا ہے۔ "غالبیات" اب ایک مستقل شعبہ ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔ میری سوچی سمجھی رائے یہ ہے کہ غالب کی صد سالہ برسی (۱۹۶۹ء) کے بعد نہ "غالبیات" کو فراموش کیا گیا ہے، نہ یہ موضوع بعض اہل علم کی رائے کے برعکس از کار رفتہ ہوا ہے، بلکہ اس عرصے میں بہت سی ایسی اہم اور موقر تصنیفات سامنے آئی ہیں جنہیں ان بارہ تیرہ برس ہی میں نہیں لگلے پچھلے برسوں کے حوالے سے بھی غالبیات میں قابلِ قدر اضافہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

۱۹۷۰ء سے ۱۹۸۲ء تک کا کوئی برس ایسا نہیں گزرا کہ غالب کے بارے میں کوئی نہ کوئی قابلِ لحاظ کتاب نہ چھپی ہو، مثلاً میں یہاں سال بہ سال صرف چار چار کتابوں کے حوالے دیتا ہوں :

۱۹۷۰ء :

جاگیرِ غالب، پرتھوی چندر، دہلی، صفحات ۱۳۱

گلِ رعنا (غالب)، مرتبہ و متعارفہ، مالک رام، دہلی، ص ۲۰۶

غالب کی شخصیت اور شاعری، رشید احمد صدیقی، دہلی صفحات ۴۵+۹۶

نقشِ غالب، اسلوب احمد انصاری، دہلی، ص ۱۴۲

۱۹۷۱ء :

تفسیرِ غالب، ڈاکٹر گیان چند، سری نگر، ص ۵۶۶

غالب کون؟ سلیم احمد، کراچی ص ۱۶۰

غالب اور آہنگِ غالب، ڈاکٹر یوسف حسین خاں، دہلی، ص ۴۴۷

جوہرِ آئینہ ـــ جائزہ کلام غالب، طالب کاشمیری، دہلی، ص ۴۴۳

۱۹۷۲ء :

غالب شناسی ۲ : ڈاکٹر ظ۔ انصاری، بمبئی ص ۲۱۹+۱۵۰

غالب : دی پوئٹ اینڈ ہز ایج، مرتبہ رالف رسل، کیمبرج، ص ۱۳۱

غالب ببلیوگرافی : ڈاکٹر محمد انصار اللہ، علیگڑھ ص ۱۲+۹۶+۱۲۲+۱۶۸+۱۸

غالب کی تہذیبی شخصیت، جیلانی کامران، راولپنڈی ص ۶+۷۰

۱۹۷۳ء :

عرفانِ غالب، مرتبہ آلِ احمد سُرور، علیگڑھ ص ۳۰۳

غالبیات کے چند مباحث، ڈاکٹر ابو محمد سحر، لکھنؤ ص ۲۱۶

تعبیرِ غالب، ڈاکٹر سید نیر مسعود رضوی، لکھنؤ ص ۲۰۸

غالب اور ان کے معترضین، سید لطیف الرحمٰن، کلکتہ ص ۴۰۰

۱۹۷۴ء :

غالب ـــ شخص اور شاعر، مجنوں گورکھپوری، کراچی ص ۱۳۶

غالب اور شاہانِ تیموریہ، ڈاکٹر خلیق انجم، دہلی ص ۱۶۰

ڈس ٹریکٹنگ ورڈز، مترجم ڈاکٹر محمد ذاکر، دہلی ص ۱۳+۸۲

غالب اور انقلاب ستاون، ڈاکٹر سید مُعین الرحمٰن لاہور، ص ۲۱۶

۱۹۷۵ء :

غالب ـــ ابتدائی دور، ڈاکٹر خورشید الاسلام، دہلی، ص ۲۸۴

گلِ رعنا (غالب)، مرتبہ و متعارفہ، سید قدرت نقوی، کراچی ص ۱۲+۲۵۵+۱۲۰

غالب اور سُرور : ایم حبیب خاں، دہلی ص ۱۳۲

مُرادِ غالب، منظور احسن عباسی، لاہور ص ۳۴۲

۱۹۷۶ء :

بیاضِ غالب — تحقیقی جائزہ : کمال احمد صدیقی
سری نگر، ص ۴۸۸
رموزِ غالب : ڈاکٹر گیان چند، دہلی ص ۳۴۴
ذکرِ غالب : مالک رام، دہلی ص ۲۷۹
غالب اور انقلاب ستاون : ڈاکٹر معین الرحمٰن،
لاہور ص ۲۸۸

۱۹۷۷ء :

اُردو غزلز آف غالب : مترجم، ڈاکٹر یوسف حسین
خاں، دہلی ص ۱۱۱ + ۳۲۶
فسانۂ غالب : مالک رام، دہلی ص ۱۹۱
غالب مدح و قدح کی روشنی میں (۱) مصباح الدین
عبد الرحمٰن، اعظم گڑھ ص ۴۴۲
غالب اور بنگال : شانتی بھٹاچاریہ، کلکتہ، ص ۱۶۸

۱۹۷۸ء :

غالب کی شخصیت اور شاعری : رشید احمد صدیقی
دہلی ص ۱۰۴
اقبال اور غالب — تخلیقی عمل کا مطالعہ : ڈاکٹر حامدی
کاشمیری، سری نگر ص ۲۳۵
متعلقاتِ غالب : کالی داس گپتا رضا، بمبئی ص ۱۶۰
دیوانِ غالب : مالک رام، لاہور ص ۲۱۶

۱۹۷۹ء :

غالب اور اقبال کی متحرک جمالیات : ڈاکٹر یوسف
حسین خاں، دہلی ص ۲۰۸
غالب — تقلید اور اجتہاد : ڈاکٹر خورشید الاسلام
علی گڑھ ص ۲۶
مطالعۂ خطوطِ غالب : عبد القوی دسنوی، لکھنؤ
ص ۱۴۰

دیوانِ غالب : مالک رام، دہلی ص ۲۱۶

۱۹۸۰ء :

پرشین غزلز آف غالب، مترجم ڈاکٹر یوسف حسین
خاں، دہلی ص ۱۹۲ + ۱۶۰
غالب کے معنوی اساتذہ : ظفر ادیب، دہلی ص ۴۹
دیوانِ غالب مرتّبہ مولانا حامد علی خاں (لاہور)
مقدمہ ڈاکٹر نور الحسن نقوی، علی گڑھ ص ۲۵۶
انتخابِ آتش و غالب، چکبست، مرتّبہ کالیداس
گپتا رضا، بمبئی ص ۱۹۶

۱۹۸۱ء :

شرح غزلیاتِ غالب (فارسی) صوفی مصطفےٰ تبسم
لاہور، جلد اول ص ۱۲ + ۴۸۴، جلد دوم ص ۶ + ۸۴۵
غالب اور صفیر بلگرامی، مشفق خواجہ، کراچی ص ۲۰۸
خطوطِ غالب کا تحقیقی مطالعہ : کاظم علی خاں،
لکھنؤ، ص ۲۱۲
تحقیقِ غالب، ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، کراچی،
ص ۲۸۸

۱۹۸۲ء :

دیوانِ غالب اُردو، نسخۂ عرشی، نقشِ ثانی، امتیاز علی
خاں عرشی، دہلی ص ۴۸ + ۱۶۰ + ۵۸۳
خطوطِ غالب سفتی تجزیہ، حامد مسعود، علیگڑھ
ص ۲۶۳
غالبیات — چند عنوانات : کالی داس گپتا رضا
بمبئی ص ۲۲۳
غالب اور عصرِ غالب : ڈاکٹر محمد ایوب قادری، کراچی
ص ۲۵۶

۱۹۷۰ء سے ۱۹۸۲ء تک کے بارہ تیرہ برسوں میں بسلسلۂ غالب، بہت کچھ لکھا گیا ہے اور برابر لکھا جا رہا ہے۔ میرے ذاتی ذخیرۂ غالبیات میں جسے کسی طرح بھی مکمل نہیں کہا جاسکتا، اس عرصے کی لکھی یا چھپی ہوئی مسلسل غالب کی کتابوں کی تعداد ڈیڑھ سو کے لگ بھگ ہے۔ اخبارات و رسائل اور ریڈیو یا ٹی وی وغیرہ کی تحریروں کا تو کوئی شمار ہی نہیں۔ یہ ساری چیزیں قدرِ اول کی نہ سہی لیکن یہ اتنا بڑا ذخیرہ اور سرمایہ ہے جسے یکسر نظر انداز بھی نہیں کیا جاسکتا۔

گذشتہ بارہ تیرہ برس کے اس ذخیرے میں تصانیفِ غالب کی اشاعتیں بھی ہیں، انتخاباتِ نظم و نثرِ غالب بھی، نگارشاتِ غالب کے تراجم بھی، کلامِ غالب کی تشریحات بھی، غالب کے اسلوبِ نثر کی پیروی اور ادبی کاوشیں بھی، غالب کی زمین میں نعت و غزلیات کے مجموعے بھی، غالب کے عہد اور اُن کی زندگی پر مبنی ڈرامے اور رپورتاژ بھی، اشاریے اور کتابیاتِ غالب بھی۔

اس عرصے میں غالب کی حیات اور فکر و فن پر متعدد نئی اعلیٰ درجے کی تنقیدی اور تحقیقی کتابیں شائع ہوئیں، بعض اہم تصنیفات کے نئے ایڈیشن نکلے اور بعض معروف اور کچھ نسبتاً کم اہم رسائل و جرائد کے غالب نمبر بھی چھپے — اور غالبیات کی تسوید و طباعت کا یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔ مختلف جامعات میں اعلیٰ تر علمی اسناد کے لئے غالب پر جو تحقیقی کام اس دوران میں ہوا یا ہو رہا ہے، وہ اس پر مستزاد ہے۔

متفرقاتِ غالب :

اس دہائی میں متعدد ایسی کتابیں بھی شائع ہوئی ہیں جو براہِ راست غالب کے بارے میں نہیں، لیکن جن کا غالب حصہ غالبیات سے متعلق ہے — یا کچھ ایسی تخلیقی

تصنیفات بھی جو غالب کے سوانح کے ذیل میں نہیں
آتیں۔ نہ انتخاب، نہ شرح، نہ ترجمہ، نہ تنقید یا تحقیق
— لیکن یہ ادبِ غالب ہی کا قابلِ قدر حصّہ ہیں:

۱) غالب کا پیار (ڈرامہ) مرزا صادق بیگ پارس
بمبئی، ۱۹۷۰ء

۲) تذکرۂ غالب وؔ "غالب پسند" آم
غلام حسین راز گجراتی گجرات، ۱۹۷۳ء

۳) تماشا اور تماشائی (غالب پر ایک اسٹیج ڈراما)
ڈاکٹر محمد حسن، دہلی ۱۹۷۵ء

۴) غالب کون ہے (ڈراما)
سیّد محمد مہدی دہلی ۱۹۸۰ء

۵) غالب کی دتی (رپورتاژ، خاکے، انشائیے)
سیّد ضمیر حسن دہلوی دہلی، ۱۹۷۷ء

۶) غالب کے نئے خطوط (غالب کے اسلوب میں)
ڈاکٹر انور سدید سرگودھا ۱۹۸۲ء

۷) پیامبرِ مغفرت، مخزنِ نعتِ مقبول (غالب کی
تمام غزلوں پر نعتوں کا مجموعہ)
ابوالعجز ساجد اسدی کراچی ۱۹۷۵ء

۸) مدحتِ خیر البشر (غالب کی زمینوں میں نعتیں)
راغب مُراد آبادی کراچی ۱۹۷۹ء

۹) پیکرِ تصویر (ہم طرحِ غالب)
سید محمد ظفر ترمذی جھنگ ۱۹۸۰ء

۱۰) فیضانِ غالب (غالب کے شاگردوں کے کلام کا انتخاب)
عرش ملسیانی دہلی ۱۹۷۷ء

۱۱) ارمغانِ ایران
ڈاکٹر وحید قریشی (مرتّب) لاہور، ۱۹۷۱ء

۱۲) اُردو تحقیق اور مالک رام
شاہد اعظمی (مرتّب) دہلی ۱۹۷۸ء

۱۳) تحریکِ جد وجہاد بطور موضوعِ سخن
خواجہ منظور حسین لاہور ۱۹۷۸ء

۱۴) گنجینۂ تحقیق
سید احمد بے خود موہانی لکھنؤ ۱۹۷۹ء

ایران کے جشنِ دوہزار و پانصد سالہ مناسبت سے
ڈاکٹر وحید قریشی کا مرتّبہ "ارمغانِ ایران" (صفحات ۲۰۲)
رسالہ "صحیفہ" (لاہور) میں ادبیاتِ فارسی سے متعلق چھپنے
والے مقالات کے ایک مختصر انتخاب پر مشتمل ہے۔
سات منتخب مقالات میں سے چار (صفحہ ۶۸ تا ۱۸۱)
غالب کی زندگی اور ان کے فکر و فن کے بارے میں ہیں۔
شاہد اعظمی کے مُرتّبہ مجموعۂ مضامین "اردو تحقیق
اور مالک رام" (صفحات ۱۸۳) کے بارہ مضامین
میں سے سات ابتدائی مضامین (۱۲۵ صفحات) مالک رام
کی فتوحات متعلق بہ غالب کا جائزہ پیش کرتے ہیں۔
"گنجینۂ تحقیق" (صفحات ۲۴۵) سید احمد بے خود موہانی
کے پانچ تنقیدی مقالات کا مجموعہ ہے جس کے ابتدائی
تین مقالات (۱۸۹ صفحات) "غالب عدیم المثال
کے ان احسانات کا حق ادا کرنے کی نظر سے لکھے گئے
ہیں جو انہوں نے اُردو علم و ادب پہ کیے ہیں —"
پروفیسر خواجہ منظور حسین کی فکر انگیز کتاب
"تحریکِ جد وجہاد بطور موضوعِ سخن" (صفحات ۷۷۶)
براہِ راست غالب کے بارے میں نہیں ہے لیکن اس کا بڑا
حصّہ غالب کے حوالے سے مباحث نے گھیرا ہے (غالب
صفحہ ۴۰ — ۶۱، ۲۷۶ — ۵۵۴، ۵۶۶ — ۵۷۷،
۵۸۶ — ۶۰۶، ۶۱۴ — ۶۲۱، ۶۶۶ — ۷۰۵، اور
۷۲۶ تا ۷۳۹)

یہ کتاب خواجہ منظور حسین کے مدۃ العمر کے غور و فکر
اور دیدہ ریزی کا ثمر ہے۔ فاضل مؤلف اور مفکّر نے
اُن جذبات اور خیالات کے سرچشمے تک پہنچنے کی
منضبط جُستجو کی ہے جو غالب اور اُن کے ہم عصر شاعروں کے
دل و دماغ میں پکتے اور اُن کے کلام میں اُبلتے رہے۔
اس خیال افروز تالیف میں سیّد احمد شہید،
شاہ اسمٰعیل شہید اور مولوی فضل حق کے ساتھ غالب
کے رشتوں کے پیچ در پیچ گتھیاں کھولی گئی ہیں اور ان
کی شاعری کے لفظی و معنوی دروبست کو ان کے
اُن کے جذباتی و فکری اُتار چڑھاؤ کی روداد اور اس
کے نفسی مُضمرات کا تجزیہ کیا گیا ہے اور بہت سے تصفیہ
طلب امور طے کیے گئے ہیں۔ خواجہ منظور حسین کی یہ کتاب
کشف و انکشاف کے ایک جہانِ تازہ ہی میں نہیں لے
جاتی، ایک اندازِ نظر بھی فراہم کرتی ہے۔ جس کی روشنی
میں پورے شعر و ادب کا ازسرِ نو مطالعہ کرنے کی ضرورت
کا احساس شدید تر ہو جاتا ہے۔

اس دہائی میں بعض علمی کتابوں میں غالب سے
متعلق الگ حصّے بھی قائم کیے گئے یا کچھ صفحات مخصوص
کیے گئے، مثلاً

۱۔ شان الحق حقّی: نکتہ راز، کراچی ۱۹۷۲ء
(تنقیدات صفحہ ۱۲۹ - ۱۵۱ و ۳۱۹ - ۳۶۲)

۲۔ ڈاکٹر وزیر آغا: نئے مقالات، لاہور، ۱۹۷۲ء
(مُطالعۂ غالب، صفحہ ۲۵۵ — ۳۱۱)

۳۔ شمس الرحمٰن فاروقی: شعر، غیر شعر اور نثر، الہٰ آباد ۱۹۷۳ء
(السلسلۂ غالب صفحہ ۲۶۴ — ۳۳۳)

۴۔ کالی داس گپتا رضا: سہو و سُراغ (مرتّب ہما بردت)
بمبئی، ۱۹۸۰ء (غالبیات، صفحہ ۱۹۵ — ۲۱۴)

۵۔ احمد ندیم قاسمی (مرتب) : نذر حمید احمد خان، لاہور ۱۹۸۱ء
(مرزا غالب، ص ۲۲۳-۲۷۱)

پچھلے دس بارہ برسوں میں غالب کے معاصرین کے بارے میں بھی کتابیں شائع ہوئیں (عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی کی کتاب مفتی صدر الدین آزردہ، دہلی ۱۹۷۷ء) تلامذۂ غالب سے متعلق بھی (مظہر معانی دیوانِ مجروح، مرتبہ ریاض احمد، لاہور ۱۹۷۸ء) عہد غالب پر بھی (خدنگ نظر، معین الدین حسن خاں، متعارفہ خواجہ احمد فاروقی، دہلی ۱۹۷۲ء) خانوادۂ غالب کے بارے میں بھی (خاندانِ لوہارو کے شعراء، حمیدہ سلطان احمد، دہلی ۱۹۸۱ء)

اس عہد زمانی (۱۹۷۰ء — ۱۹۸۲ء) میں غالب کے معاصرین پر پی ایچ۔ ڈی / ڈی۔ لٹ کی سطح کے تحقیقی اور تنقیدی کام کو بھی صورتِ اشاعت نصیب ہوئی:

۱۔ ممنون دہلوی۔ حیات، شخصیت اور شاعری
ڈاکٹر منشاء الرحمٰن خان منشا ناگپور ۱۹۷۲ء

۲۔ مومن — شخصیت اور فن
ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی دہلی ۱۹۷۲ء

۳۔ نساخ — حیات و تصانیف
ڈاکٹر محمد صدر الحق کراچی ۱۹۷۹ء

۴۔ کلیاتِ ذوقی (اردو) ترتیب
ڈاکٹر تنویر احمد علوی دہلی ۱۹۸۰ء

بعض معروف غالب شناس اہل علم پر تحقیقی و تنقیدی مقالے بھی شائع ہوئے:

۱۔ نیاز فتح پوری ڈاکٹر امیر عارفی دہلی ۱۹۷۷ء
۲۔ اثر لکھنوی۔ حیات اور کارنامے
محمود خاور حیدر آباد دکن ۱۹۷۷ء

تلامذۂ غالب پر تحقیقی کام بھی منظرِ عام پر آیا، حالی سے قطع نظر، مثلاً: "غالب کا عظیم المرتبت شاگرد صفیر بلگرامی — حیات و کارنامے" (مطبوعہ کلکتہ جون ۱۹۷۶ء) پر ڈاکٹر ظفر اوگانوی کو پٹنہ یونیورسٹی سے پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری ملی۔ شارحینِ غالب پر بھی تحقیق ہوئی۔ حسرت موہانی سے قطع نظر، مثلاً "نظم طباطبائی — حیات اور کارناموں کا تنقیدی مطالعہ" (مطبوعہ حیدر آباد دکن دسمبر ۱۹۷۳ء) ڈاکٹر اشرف رفیع کا تحقیقی مقالہ ہے جس پر انہوں نے جامعہ عثمانیہ سے ڈاکٹریٹ پایا۔

اس عرصے میں برّعظیم پاک و ہند کے بہت سے معروف اور ممتاز غالب شناسوں سے محرومی کا داغ بھی سہنا پڑا۔ بعض اسماء حافظے پر زور دیئے بغیر نوکِ قلم پر آ سکتے ہیں:

۱۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف حیدر آباد دکن ۴ر نومبر ۱۹۷۱ء
۲۔ مولانا غلام رسول مہر لاہور ۱۶ر نومبر ۱۹۷۱ء
۳۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی الہ آباد ۲۸ر جولائی ۱۹۷۲ء
۴۔ ڈاکٹر ایس۔ ایم۔ اکرام لاہور ۱۷ر جنوری ۱۹۷۳ء
۵۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری کراچی ۱۹ر مارچ ۱۹۷۳ء
۶۔ حمید احمد خاں لاہور ۲۲ر مارچ ۱۹۷۴ء
۷۔ عبدالرحمٰن چغتائی لاہور ۱۷ر جنوری ۱۹۷۵ء
۸۔ مسعود حسن رضوی ادیب لکھنؤ ۲۹ر نومبر ۱۹۷۵ء
۹۔ سید وقار عظیم لاہور ۱۷ر نومبر ۱۹۷۶ء
۱۰۔ تحسین سروری کراچی ۷ر دسمبر ۱۹۷۶ء
۱۱۔ رشید احمد صدیقی علی گڑھ ۱۵ر جنوری ۱۹۷۷ء
۱۲۔ مسلم ضیائی کراچی ۵ر جون ۱۹۷۷ء
۱۳۔ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم لاہور ۷ر فروری ۱۹۷۸ء
۱۴۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں دہلی ۲۱ر فروری ۱۹۷۹ء
۱۵۔ سید وزیر الحسن عابدی لاہور ۲۹ر جون ۱۹۷۹ء
۱۶۔ مولانا امتیاز علی خاں عرشی رامپور ۲۵ر فروری ۱۹۸۱ء

ان غالب شناس بزرگوں کے انتقال پر اخبارات و رسائل نے اپنی اشاعتیں وقف کیں یا مقالات و مضامین کی اشاعت کا خاص اہتمام کیا، پی ایچ۔ ڈی کی سطح کا کام منظرِ عام پر آیا (رشید احمد صدیقی — شخصیت اور فن، ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید، مطبوعہ حیدر آباد دکن، جون ۱۹۷۶ء) ان غالب شناس اصحاب میں سے متعدد کے بارے میں پی ایچ ڈی کے لیے مقالے لکھے گئے یا لکھے جا رہے ہیں۔

ان اصحاب کے بارے میں کسی ڈگری کی قید سے آزاد سوانحی اور تنقیدی یا یادگاری کتابیں بھی آئیں (آپ بیتی — رشید احمد صدیقی، مرتبہ: ڈاکٹر سید معین الرحمٰن مطبوعہ لاہور ۱۹۷۰ء، ۱۹۷۴ء، ۱۹۸۰ء، مطبوعہ دہلی ۱۹۷۷ء) برّعظیم پاک و ہند کے پہلے "غالب پروفیسر" سید وقار عظیم کے بارے میں کتاب: "سید وقار عظیم — سوانحی خاکہ" ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، اشاعت کراچی، ۱۹۸۰ء)۔ یا مثلاً: مرزا جعفر حسین کی کتاب "مسعود حسن رضوی ادیب — حیات و خدمات" (مطبوعہ لکھنؤ، ۱۹۷۷ء)

اسی ذیل کا ایک قابلِ قدر مجموعہ "عبدالرحمٰن چغتائی — شخصیت اور فن" (مطبوعہ لاہور مئی ۱۹۸۰ء) ہے اسے ڈاکٹر وزیر آغا نے مرتب کیا ہے۔ اس ارمغان میں مختلف اہلِ قلم حضرات کے مضامین شامل ہیں خود ڈاکٹر وزیر آغا کے بقول: "اس تالیف کا مقصد چغتائی کے فن کی توضیح سے کہیں زیادہ اس کی رفعت و عظمت کا اعتراف ہے۔ اب اس کے بعد اہلِ نظر چغتائی کے فن کا بھرپور مطالعہ کرنے کی طرف راغب ہوں گے اور اس سلسلے میں مضامینِ نو کے انبار لگاتے چلے جائیں گے۔" (بقیہ صفحہ ۲۰ پر)

رثائے غالبؔ میں انیسؔ کی رُباعی

محمد صادق صفوی

ذیل میں نادر سندِ تاریخی کا تعارف کرایا جاتا ہے۔ یہ سند، میر انیس کی ایک رباعی پر مبنی ہے جو انہوں نے غالب کی وفات پر نظم کی تھی۔ آخر فروری ۱۹۸۲ء میں راقم کو ایک بزرگ کے خط سے اس رباعی کا علم ہوا۔ جس کی متعلقہ عبارت یہ تھی۔

"میر انیسؔ مرحوم کو غالبؔ سے تعلق تھا۔ غالب کی جب وفات ہوئی تو میر صاحب مرحوم نے ایک رُباعی کہی جو مہاراجہ محمود آباد کے کتب خانے میں میر صاحب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی اب تک محفوظ ہے۔ رباعی حسب ذیل ہے:

گلزارِ جہاں سے باغِ جنت میں گئے
مرحوم ہوئے، جوارِ رحمت میں گئے
مداحِ علیؑ کا مرتبہ اعلیٰ ہے
غالبؔ، اسد اللہ کی خدمت میں گئے

خانوادۂ محمود آباد اپنے بذل و کرم کی صفات میں مشہور ہے۔ راقم نے کسی سابقہ معرفت کے بغیر محض اسی حسن ظن کی بنا پر ۶ مارچ ۱۹۸۲ء کو صاحبزادہ نواب محمد امیر حیدر خاں صاحب کی خدمت میں ایک عریضہ ارسال کیا اور اُن سے مُبیّنہ روایت کی تائید یا تردید کی درخواست کی اور اُن سے یہ فرمائش بھی کی کہ اگر مذکورہ رباعی اُن کے ذخیرے میں موجود ہو تو اس کا عکس مرحمت فرمائیں۔ انہوں نے ۲۵ مارچ کو مجھے جواب تحریر فرمایا۔ راقم کو جو حسنِ ظن ان کی رأفت و عنایت کی طرف سے تھا، اُن کے عنایت نامے سے اس کی تصدیق ہوئی۔ انہوں نے اس رباعی کے متعلق بیان کردہ روایت کی تائید بھی فرمائی اور اس کی فوٹو نقل بھی مجھے بھیج دی۔

مہاراج کمار نواب محمد امیر حیدر خاں کے خط سے معلوم ہوا کہ اس رباعی کا اصلی نسخۂ دستنویسِ انیس اُن کے پاس نہیں ہے، البتہ اس نسخۂ اصل کی فوٹو کاپی اُن کے ذخیرے میں موجود ہے۔ نواب زادہ صاحب نے تحریر فرمایا کہ میر محمد عباس پسر میر محمد عباس پسر میر علی احمد داصف نے اسی خطی نسخے کا عکس انہیں عنایت فرمایا تھا۔ میر محمد عباس کا انتقال ہو چکا۔ وہ مرحوم لاولد تھے، خدا جانے اب اس رباعی کا نسخۂ اصل کس کے پاس ہوگا۔

یہ رُباعی میر انیس کی زادۂ فکر ہے۔ اس کے ثبوت کے لیے صرفاً اسے پڑھنا ہی کافی ہے:

آفتاب آمد دلیلِ آفتاب

جو سخن شناس، میر انیس کے شیوۂ بیان شیوائی زبان اور خصوصاً اُن کے سبکِ رُباعیات سے واقف ہے، اُن کے نزدیک اس رباعی کا ہر ہر مصرع گواہی دیتا ہے کہ یہ انیس کا کلام ہے، کسی اور کا نہیں۔

اسی طرح اہلِ نظر حضرات پر میر انیس کی اس رباعی کا بخطِ انیس ہونا بھی روزِ روشن کی طرح واضح ہے۔ اب تک میر انیس کے قلم کی تحریریں جابجا اُن کے قدردانوں کے ذخائر میں موجود ہیں۔ ان خصوصی اور شخصی ذخائر کے علاوہ بعض مطبوعہ کتب میں میر انیس کی تحریروں کے بلاک چھپ چکے ہیں مثلاً "مراثی انیس" جلد تین، مطبع نظامی، بدایوں ۱۹۳۰ء میں میر انیس کے لکھے ہوئے چار بندوں کا عکس موجود ہے:

(جب حُر کو ملا خلعتِ پُرخونِ شہادت)

اسی طرح "روحِ انیس" مرتبہ مسعود حسن رضوی ادیب الہ آباد میں میر انیس کے ہاتھ کے لکھے ہو چار بندوں کا عکس شامل ہے۔

(مجلس کا انتظام اسی شہر پہ ہے ختم)

یہ چھپی ہوئی کتابیں عام دسترس میں ہیں یہاں میں میرانیس کی تحریروں کی جو عکسی نقلیں موجود ہیں اُن سے اس رُباعی کے خطی عکس کو ملا کر دیکھ لیا جائے۔ شانِ خط میں بال بھر کا فرق نظر نہ آئے گا۔

ان داخلی شہادتوں کے علاوہ اس انتساب کے راوی کو بھی نظر میں رکھنا چاہیے۔ نوابزادہ محمود آباد نے ان بزرگ کا نام میر محمد عباس پسر میر علی احمد واصف لکھا ہے۔ یہ بزرگ آلِ انیس و نفیس سے تھے۔ میں نے میر انیس سے ان کا صحیح رشتہ معلوم کرنے کے لئے خاندانِ انیس کے ایک جواں سال، خوش قریحہ، صاحبِ خبرت و بصیرت نمائندے جناب سید علی احمد دانش (نواسۂ پسری میر علی محمد عارف دختر زادۂ میر نفیس) سے رجوع کیا۔ انہوں نے ازراہِ عنایت اپنے مکتوب مورخہ ۲۴ رمئی ۱۹۸۲ء میں اولادِ انیس کا مفصل شجرہ لکھ کر مجھے بھیج دیا۔ اس نسب نامے کا متعلقہ جز نقل کرتا ہوں:

انیس
- نفیس
  - دختر
    - سید علی محمد عارف
      - سید محمد ہادی لائق
        - سید علی احمد دانش
- دختر
  - سید علی مانوس
    - سید علی احمد واصف
      - سید محمد عباس آصف (لاولد)

اِس شجرے سے معلوم ہوتا ہے کہ نوابزادہ محمود آباد نواب محمد امیر حیدر خاں کے راوی سیّد محمد عباس میر انیس کے نواسے سیّد علی مانوس کے پوتے تھے اور میر نفیس کے نواسے سیّد علی احمد واصف کے بیٹے تھے۔ اگر ایسا ثقہ راوی اس رُباعی کا انتساب میر انیس سے کرتا ہے تو پھر اس میں شک و تردید کا کوئی محل باقی نہیں رہتا۔

آخر میں اِس رباعی کی ایک اور مزیت کی طرف اشارہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے شاید یہ منظومہ ایک اعتبار سے فارسی اور اُردو کے رثائی ادب میں منفرد سمجھا جا سکتا ہے۔ فارسی کے عظیم ترین شاعر فردوسی، نظامی رومی، سعدی، خسرو اور حافظ تھے اور اُردو کے عظیم ترین شاعر میر، سودا، غالب اور انیس ـــ راقم کے علم میں اس فہرست کے کسی اور استادِ سخن نے اپنے ہم پایہ معاصر یا غیر معاصر سخنور کی رثا میں کچھ نہیں کہا۔ رودکی نے شہید کے ماتم میں شعر کہے ہیں لیکن وہ دونوں سخن گو راقم کے نامبردہ نوابغ کے ہم رتبہ نہ تھے۔ رودکی کو ان کا ہم ردیف مان بھی لیا جائے لیکن شہید ہرگز ان اکابرِ نظم کا ہم قطار نہ تھا۔ یہ شرف غالب کے لئے مخصوص تھا کہ اُس کے مرنے پر اُسی جیسے کے قلم نے آنسو بہائے۔

بقیہ از صفحہ ۱۸

اسی نوع کا ایک یادگاری ارمغان "نذرِ حمید احمد خاں" ہے (مطبوعہ لاہور دسمبر ۱۹۸۰ء) جسے احمد ندیم قاسمی نے مُرتب کیا ہے۔ انہوں نے بالکل صحیح کہا ہے کہ "یہ مجموعۂ مقالات اُن سب اصحاب کی طرف سے جن کے افکار اس کتاب میں شامل ہیں، اور خود مُرتب کی طرف سے، مرحوم کی شخصیت کے حضور ایک نذرانۂ عقیدت ہے۔ وہ زندہ ہوتے تو اس کتاب کے مندرجات کے معیار کو یقیناً بہ نظرِ استحسان دیکھتے۔"

غالبؔ، اقبالؔ کے عظیم پیشرو

ڈاکٹر محمد ریاض

غالبؔ مسلمہ طور پر اقبال سے قبل برصغیر میں اُردو اور فارسی کے سب سے بڑے شاعر تھے۔ وہ ایک متنوع شخصیت اور غیر معمولی دل و دماغ کے آدمی تھے۔ اپنی فارسی پر انہیں ناز تھا۔ مگر اپنی اُردو شاعری کو بھی بجا طور پر وہ مثیلِ فارسی جانتے تھے!

فارسی بین تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اُردو کہ بیرنگِ من است

فارسی بین تا بدانی کاندر اقلیمِ خیال
مانی و ارژنگم و آن نسخہ ارژنگ من است

جو یہ کہے کہ ریختہ کیوں کر ہو رشکِ فارسی
گفتۂ غالبؔ ایک بار پڑھ کے اُسے سنا کہ یوں

غالبؔ اصل کے اعتبار سے ماوراء النہری ترک تھے۔ آگرہ میں متولد ہوئے ۱۳ برس کی عمر میں دہلی منتقل ہوئے اور تادمِ مرگ یہیں رہے۔ ان کا دورِ حیات پرآشوب و انحطاط تھا۔ مگر جس طرح چنگیز اور اولادِ چنگیز کی سفاکیاں رومی اور سعدی پر اثر انداز نہ ہوئیں اور امیر تیمور کے تہاجمات خواجہ حافظ کے نبوغ کو نہ دبا سکے، اسی طرح غالب بھی سکھوں اور مسلمانوں کی جنگ ۱۸۳۱ء فارسی کی جگہ انگریزی کے سرکاری زبان بن جانے (۱۸۳۴ء) جنگ آزادی ۱۸۵۷ء اور اس کے خونچکاں عواقب، اور سلطنتِ تیموری کا چراغ گل ہو جانے کے دل شکن اور پُراندوہ واقعات سے دوچار ہونے کے باوجود اُردو و فارسی کے نثر و نظم میں اپنا بلند مقام قائم رکھ سکے ہیں۔

غالب اپنی فارسی شاعری میں چند ایرانی شعراء (بجز امیر خسرو) کی تقلید سے اظہارِ برأت فرماتے رہے۔ میرزا بیدل کی تقلید میں انہوں نے ریختہ (اُردو) لکھنے کا اعتراف فرمایا ہے مگر قرائن بتلاتے ہیں کہ بیدل اور کئی ہندی فارسی شعراء کا ان کے اُردو اور فارسی کلام پر کافی اثر رہا ہے۔ دراصل برہان قاطع کے معرکے میں غالب اہل زبان اور غیر اہل زبان فارسی شعراء کے ذکر سے اپنا دفاع کرتے رہے ہیں، غالب کی مشکل گوئی کی شکایات ان کے معاصرین کی تصانیف میں منعکس ہیں مگر دورِ جوانی کے بعد غالب نے ایک معتدل رویہ اختیار رکھا اور نام پیدا کیا۔ غالب کی فارسی نثر دلآویز ہے۔ دستنبو میں انہوں نے خالص فارسی میں جنگ آزادی کے واقعات لکھے ہیں۔ اردو نثر میں ان کے مکتوبات کم نظیر ہیں۔ ان کا فارسی کلام تقریباً ہموار ہے مگر اُردو کلام کی بات ہی اور ہے۔ منکرِ شاعری بھی ان کا اُردو کلام سن یا پڑھ کر شعر کی افادیت پر ایمان لا سکتا ہے۔

مرزا غالب ہمارے ثقافتی سرمایے کی ایک نمایاں کڑی ہیں۔ پاکستان میں ان کے بارے میں تحقیق و تنقید کا سلسلہ جاری ہے۔ ۱۹۶۹ء میں ان کی صد سالہ برسی کی مناسبت سے ہمارے ہاں نیز ہندوستان افغانستان، ایران، روس، برطانیہ اور امریکہ وغیرہ میں ان کے بارے میں کافی کتابیں لکھی گئیں۔ برصغیر میں اقبالؔ کے دورِ کہولت تک، نظیرِ غالب کا پیدا ہونا ایک عجوبۂ قدرت سے کم نہ سمجھا جاتا تھا۔ اقبال کی شاعری اور شخصیت کے بارے میں لوگوں کو جو اچنبھا تھا۔ وہ شیخ عبدالقادر کی دیباچہ بانگ درا کی حسب ذیل عبارت سے ظاہر ہے۔

"کسے خبر تھی کہ غالب مرحوم کے بعد ہندوستان میں پھر کوئی ایسا شخص پیدا ہوگا جو اردو شاعری کے جسم میں ایک نئی روح پھونک دے گا اور جس کی بدولت غالب کا بے نظیر تخیل اور نرالا اندازِ بیان پھر وجود میں آئیں گے اور ادبِ اُردو کے فروغ کا باعث ہوں گے۔ مگر زبان اردو کی خوش اقبالی دیکھیے کہ

اس زمانے میں اقبال سا شاعر اُسے نصیب ہوا جس
کے کلام کا سکہ ہندوستان بھر کی اردو داں دُنیا
کے دلوں پر بیٹھا ہوا ہے اور جس کی شہرت روم و
ایران بلکہ فرنگستان تک پہنچ گئی ہے۔ غالب اور
اقبال میں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ اگر میں تناسخ
کا قائل ہوتا تو ضرور کہتا کہ مرزا اسد اللہ خان غالب
کو اُردو اور فارسی کی شاعری سے جو عشق تھا۔ اُس
نے ان کی روح کو عدم میں جا کر بھی چین نہ لینے دیا اور
مجبور کیا کہ وہ پھر کسی جسدِ خاکی میں جلوہ افروز ہو کر
شاعری کے چمن کی آبیاری کرے اور اس نے پنجاب
کے ایک گوشہ میں جسے سیالکوٹ کہتے ہیں دوبارہ
جنم لیا۔ اور محمد اقبال نام پایا.....؟"

اقبال۔ غالب کے فکر و فن کے بے حد مداح
تھے اپنی ایک مسدس نظم، مرزا غالب میں انہوں
نے بیس توصیفی شعر کہے ہیں۔ جیسے!

فکرِ انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا
ہے پرِ مرغِ تخیل کی رسائی تا کجا
تھا سراپا روح تو، بزمِ سخن پیکر تیرا
زیبِ محفل بھی رہا، محفل سے پنہاں بھی رہا
دید تیری آنکھ کو اس حسن کی منظور ہے
بن کے سوزِ زندگی ہر شے میں جو مستور ہے
تیرے فردوسِ تخیل سے ہے قدرت کی بہار
تیری کشتِ فکر سے اگتے ہیں عالم سبزہ وار
نطق کو سو ناز ہیں تیرے لبِ اعجاز پر
محوِ حیرت ہے ثریا رفعتِ پرواز پر
شاہدِ مضموں تصدق ہے ترے انداز پر
خندہ زن ہے غنچۂ دلی گلِ شیراز پر
لطفِ گویائی میں تیری ہمسری ممکن نہیں
ہو تخیل کا نہ جب تک فکرِ کامل ہم نشیں

اپنی انگریزی یادداشتوں میں اقبال لکھتے ہیں
کہ وہ اپنے فکر و فن میں بیدل کی مانند غالب کے بھی
بے حد مرہونِ منت ہیں، ان شعراء نے انہیں اشیا
کا اندرون دیکھنے میں مدد کی اور روحِ مشرقی
کو جذب کرنے کے گر سکھائے ہیں۔ ایک دوسرے
مقام پر آپ نے لکھا کہ غالب مسلمانانِ ہند کا ایک
اصیل سرمایہ ہیں۔ ان ایسے شعراء مذہب اور قومیت
کے حدود سے بالاتر ہیں مگر مرزا کی مقبولیت میں
ابھی مزید اضافہ ہوگا۔

۱۹۳۶ء میں یومِ غالب کی مناسبت سے آپ نے
مندرجہ ذیل دو توصیفی شعر لکھے اور خواجہ حسن نظامی
کو ارسال کیے تھے!

دریں محفل کہ افسونِ فرنگ از خود برد ما را
نگاہِ پردہ سوز آور۔ دلے دانائے راز آور
مے این ساقیانِ لالہ رو ذوقے نمی بخشد
ز فیضِ حضرتِ غالب ہماں پیمانہ باز آور

اسی مناسبت سے ۱۵ فروری ۱۹۳۷ء کو انجمن اردو
پنجاب، کو آپ نے ایک پیغام دیا۔ اس میں انہوں نے
مسلمان نوجوانوں کو مشورہ دیا کہ غالب کی اہم ترشعری زبان
فارسی کا دامن نہ چھوڑیں، غالب کا خصوصی مطالعہ کریں
اور بیدل و غالب کے فکری و فنی روابط پر تحقیق کریں"
(دیکھیں گفتار اقبال صفحہ ۲۰۷)

تضمینات

اقبال نے غالب کے کئی اُردو و فارسی اشعار پر
تضمین کی ہے۔ فارسی شعراء کی تضمینات تو اقبال
کے ہاں فراواں ہیں۔ مگر اُردو اشعار انہوں نے
شاذ نقل کئے ہیں۔ ان اشعار میں بیشتر غالب کی
تضمینات نظر آتی ہیں۔

"اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے"
غالب کا قول سچ ہے تو پھر ذکرِ غیر کیا
میرزا غالب خدا بخشے بجا فرما گئے (۲)
"ہم نے یہ مانا کہ دلّی میں رہیں کھائیں گے کیا"
"جاتا ہوں تھوڑی دور ہر ایک راہرو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں"
حرف چوں طائر بہ پرواز آورد (۳)
نغمہ را بے زخمہ از ساز آورد (بہ تغیر)
"مژدہ صبح دریں تیرہ شبانم دادند
شمع کشتند و ز خورشید نشانم دادند"
تا بادہ تلخ تر شود و سینہ ریش تر (۴)
بگدازم آبگینہ و در ساغر افگنم
غالب کا ایک دو شعری قطعہ ہے
فرصت اگرت دست دہد مغتنم انگار
ساقی و مغنی و شرابے و سرودے
زنہار از آں قوم نباشی کہ فریبند
حق را بہ سجودے و نبی را بہ درودے
اقبال نے بالِ جبریل کی ایک نظم "فرمانِ خدا (فرشتوں
سے)" میں دوسرے شعر سے کسی قدر استفادہ کیا ہے۔
حق را بہ سجودے صنماں را بطوافے
بہتر ہے چراغ حرم و دیر بجھا دو
علامہ اقبال کی کتاب جاوید نامہ میں غالب کا بڑا معنی
خیز ذکر ہے۔

فلکِ مشتری پر اقبال، روحِ غالب کو حسین بن منصور حلّاج (م ۳۰۱ء) اور قرۃ العین طاہرہ بابیہ (د ۱۸۵۲ء) کی ارواح کے ساتھ بیرونِ بہشت سیر و سیاحت میں دکھاتے ہیں۔ یہاں اقبال، غالب سے ان کے معروف اردو شعر کے معانی پوچھ کر درج کرتے ہیں۔ اقبال نے "کیا ہے" کو "چیست" سے بدل کر شعر کو بصورتِ فارسی درج کیا ہے۔

قمری کفِ خاکستر و بلبل قفس رنگ
اے نالہ نشانِ جگرِ سوختہ چیست

شعر کے معنی بھی ملاحظہ ہوں:

نالہ کو خیزد از سوزِ جگر
ہر کجا تاثیر او دیدم دگر
قمری از تاثیر او واسوختہ
بلبل از وے رنگہا اندوختہ
اندرو مرگے بآغوشِ حیات
یک نفس اینجا حیات۔ آنجا ممات
آنچنان رنگے کہ ارژنگی ازوست
آنچناں رنگے کہ بیرنگی ازوست
تو ندانی این مقام رنگ و بوست
قسمتِ ہر دل بقدرِ ہائے و ہوست
یا برنگ آ۔ یا بہ بیرنگی گزر
تا نشانی گیری از سوزِ جگر

نوائے غالب کے تحت، علامہ مرحوم میرزا کی ایک مستانہ فارسی غزل کا انتخاب درج کرتے ہیں:

بیا کہ قاعدۂ آسمان بگردانیم
قضا بگردشِ رطلِ گراں بگردانیم
اگر ز شحنہ بود گیر و دار نیندیشیم
وگر ز شاہ رسد ارمغاں بگردانیم
اگر کلیمؑ شود ہمزبان سخن نکنیم
وگر خلیلؑ شود میہماں بگردانیم
بجنگ باج ستانان شاخسارے را
تہی سبد ز در گلستاں بگردانیم
بصلح بال فشانان صبح گاہی را
ز شاخسار سوی آشیاں بگردانیم
ز حیدریم من و تو ز ما عجب نبود
گر آفتاب سوئے خاوراں بگردانیم

اس کے بعد حقیقت رحمۃ للعالمینؐ کے بارے میں میرزا سے بحث کرتے اور ان کی مثنوی وامکان نظیر یا امتناع نظیر حضرت خاتم الانبیاءؐ سے ایک شعر نقل کرتے ہیں:

زندہ رود: صد جہاں پیدا درین نیلی فضاست
ہر جہاں را اولیاء و انبیا ست؟

غالب: نیک بنگر اندریں بود و نبود
پی بہ پی آید جہانہا در وجود
"ہر کجا ہنگامۂ عالم بود
رحمۃ للعالمینی ہم بود"

زندہ رود: فاش تر گو زانکہ فہمم نارساست

غالب: این سخن را فاش تر گفتن خطاست

زندہ رود: گفتگوئے اہلِ دل بے حاصل است؟

غالب: نکتہ را بر لب رسیدن مشکل است

زندہ رود: تو سراپا آتش از سوزِ غالب
بر سخن غالب نیائی اے عجب،

غالب: خلق و تقدیر و ہدایت ابتدا است
رحمۃ للعالمینی انتہا ست

زندہ رود: من ندیدم چہرۂ معنی ہنوز
آتشی داری اگر ما را بسوز

غالب: ای چو من بینندۂ اسرارِ شعر
این سخن افزون تراست از تارِ شعر
شاعران بزم سخن آراستند
این کلیمان بی ید بیضا ستند
آنچہ تو از من نخواہی کافری است
کافری کو ماورائے شاعری است

اس کے بعد حسین بن منصور حلاج توضیحاً کہتے ہیں:

ہر کجا بینی جہان رنگ و بو
آن کہ از خاکش بروید آرزو
یا ز نورِ مصطفیٰؐ او را بہاست
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰؐ است

آنحضرتؐ کے مقامِ بشریت اور عبدیت کے بارے میں بے حد دلآویز بحث چونکہ ابن حلاج سے مربوط کی گئی۔ اس لئے اس سے یہاں صرف نظر کرتے ہوئے، حقیقتِ رحمۃ للعالمینیؐ کے بارے میں اقبال کی گفتگو کے سیاق کے بارے میں چند سطریں ہم لکھتے ہیں۔

انیسویں صدی کے ربعِ اوّل میں مرزا غالب کے دو بزرگ معاصرین مولانا حیدر بخش اور شاہ اسماعیل شہید دہلوی (م۔ ۱۸۳۱ء) کے درمیان ایک مذہبی بحث مسئلہ قدرت الٰہی پر چھڑی تھی اس کا موضوع اوپر میرزا غالب کی مثنوی کے عنوان میں بھی درج ہوا ہے۔

شاہ اسماعیل کا مؤقف یہ تھا کہ حضرت محمد مصطفیٰؐ خاتم النبیینؐ ہی نہ تھے۔ کائنات کی کامل ترین ہستی بھی

تھے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایسے کسی دوسرے
کی تخلیق محال اور غیر ممکن ہے۔ مولانا حیدر بخش آنحضرتؐ
کی ختمِ نبوت اور ان کے کامل ترین فرد ہونے کے
قائل تھے۔ ان کے نزدیک آنحضرتؐ، انبیاء کے
سردار تھے مگر ان ایسے کسی دوسرے کی تخلیق کو
وہ قدرتِ خداوندی کے لئے محال اور غیر ممکن
نہیں مانتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اس سے عجزِ تخلیق
لازم آتی ہے۔ جب کہ خدا تعالیٰ ہر لحظہ سب کچھ
پیدا کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ یہ مباحث میرزا
غالب ایسے ذکی اور نابغہ نوجوان کے لئے قابلِ توجہ
تھے۔ میرزا، شاہ اسماعیل اور مولانا حیدر بخش
کے ارادت مند تھے۔ دونوں نے مولانا فضل الحق
خیرآبادی کے ذریعے ان سے استعانت چاہی اور
غالب نے مندرجہ بالا عنوان کے تحت ۱۲۸ اشعار
کی حامل ایک فارسی مثنوی لکھی۔ غالب نے اگرچہ
مولانا فضل حق اور دیگر مخالفینِ شاہ اسماعیل کے
موقف کی حمایت کی مگر اس کے ساتھ ساتھ شاہ اسماعیل
کے نظریہ کو بھی رد نہ کیا۔ آپ کے دلائل کا خلاصہ
یہ ہے۔ کہ اگرچہ خدا تعالیٰ ہر چیز پیدا کرنے پر
قادر ہے۔ مگر اس کے کام خالی از حکمت نہیں حکمت
کا تقاضا یہ ہے کہ ایک جہاں میں ایک ہی رحمۃ للعالمین
اور خاتم النبیین پیدا کرے۔ غالب کے ہاں پوری کائنات
ایک جہان قرار دی گئی ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ کسی دوسرے
کی تخلیق بلاجواز ہوگی، کہتے ہیں ان کے ہم عمر دوست
مولانا فضل حق، میرزا کی مثنوی دیکھ کر بہت ہنسے
اور فرمایا:

میرزا، خوب اُستادی دکھائی کہ سب کی حمایت
کردی۔ اقبال نے ان ہی معانی کی طرف اشارہ فرمایا ہے[1]

اقبال کے ہاں غالب کے مضامین کے اقتباس
کرنے (تحولات) اور فارسی شاعری میں پیروی کے
مواقع بہت کم ہیں۔ جیسے

غالب: با من میاویز ای پسر، فرزند آذر را نگر
ہر کس کہ شد صاحب نظر، دینِ بزرگاں خوش نکرد

اقبال: چہ خوش بودی اگر مردِ نکو پی
زبندِ باستان آزاد رفتی
اگر تقلید بودی شیوۂ خوب
پیمبرؐ ہم رہِ اجداد رفتی

غالب: خوی آدم دارم۔ آدم زادہ ام
آشکارا دم زعصیان می زنم

اقبال: چون بر وید آدم از مشتِ گل
با دلی، آرزوی در دلی
لذتِ عصیان چشیدن کار اوست
غیر خود چیزی ندیدن کار اوست
زانکہ بی عصیان خودی ناید بدست
تا خودی ناید بدست آید شکست (جاوید نامہ)

غالب: سوخت جگر تا کجا رنج چکیدن دہیم
رنگ شو ای خون گرم تا بہ پریدن دہیم

اقبال: مثل شرر ذرہ را تن بہ تپیدن دہم
تن بہ تپیدن دہم، بال پریدن دہم

غالب: اختری خوشتر از نیم جہاں می بایست
خود بپیرانہ جوان می بایست

اقبال: باز این عالم دیرینہ قرآن می بایست
برگ کاہش صفت کوہ گران می بایست

غالب: نقاب دار کہ آئین رہزنی دارد
جہانِ یوسفی و فرّ بہمنی دارد

اقبال: قریبِ کشمکشِ عقل دیدنی دارد
کہ میرِ قافلہ و ذوقِ رہزنی دارد

حوالے:

[1] STRAY REFLECTIONS مطبوعہ لاہور ۱۹۶۱ء

[2] پہلے شعر کا دوسرا اور دوسرے کا پہلا مصرع لیا ہے:
حیران ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں
ہے اس معمورے میں اب قحطِ غمِ الفت اسد

[3] اسرارِ خودی

[4] تضمین شدہ در پیامِ مشرق

[5] تفصیل دیکھیں
سہ ماہی العلم کراچی باب فروری ۱۹۶۹ء کے
غالب نمبر۔ مقالہ از سخاوت مرزا

حیاتِ غالب کے خدوخال

ادارہ

۴۹ـ۱۷۴۸ء غالب کے دادا مرزا قوقان بیگ خان کا ترکستان سے ہجرت کر کے ہند میں آنا۔

۱۷۹۳ء ـ غالب کے والد مرزا عبداللہ بیگ خان کی غلام حسین کیدان کی دختر عزت النسا بیگم سے شادی ۸ جنوری ۱۷۹۷ء غالب کی ولادت بمقام آگرہ۔ غالب کی صحیح تاریخ پیدائش کے متعلق خاصہ عرصہ ایک بحث ماہِ نو میں چلتی رہی جس میں محققین و منجمین کے مضامین شائع ہوتے رہے۔ غالب نے خود اپنی تاریخ پیدائش ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء (۸ رجب ۱۲۱۲ھ) بتائی تھی اس سلسلے میں انہوں نے اپنا جو زائچہ بیان کیا تھا، اس میں وہ اشکال پیدا نہیں ہوتی تھیں، جو انہوں نے بیان کی تھیں بالآخر سید صمد حسین رضوی نے ماہِ نو فروری ۱۹۷۰ء میں ایک فیصلہ کن مضمون پیش کیا اور علم نجوم کی روشنی میں ایک قطعی تاریخ ۸ جنوری ۱۷۹۷ء مستحکم کر دی۔ ان کے بنائے ہوئے زائچوں اور حساب کو ہندوستان کے اسٹرولوجیکل بیورو کے ڈائریکٹر نے بھی صحیح اور درست قرار دیا۔

۱۷۹۹ـ مرزا یوسف برادرِ اصغر مرزا غالب کی پیدائش مرزا یوسف کا ذہنی توازن صحیح نہیں تھا۔ اور غالب ہی عرصہ دراز تک ان کی کفالت کرتے رہے۔

۱۸۰۲ء میں مرزا غالب کے والد مرزا عبداللہ بیگ خان راج گڑھ کے مقام پر ایک فوجی معرکے میں مارے گئے۔

۱۸۰۳ء میں غالب کے چچا مرزا نصراللہ بیگ خان نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی افواج میں ملازمت اختیار کی۔ ۱۸۰۶ء میں غالب کے چچا مرزا نصراللہ بیگ خان ہاتھی سے گر کر راہیٔ ملکِ بقا ہوئے۔

۴ مئی ۱۸۰۶ء میں نواب احمد بخش خان کو مرزا نصراللہ بیگ خان کے ورثا کو دس ہزار سالانہ ادا کرنے کا ذمہ دار بنایا گیا۔ مگر نواب احمد بخش نے یہ رقم کبھی ادا نہ کی انہوں نے اس کے متوازی ایک حکم یہ لے لیا کہ نصراللہ بیگ خان کے ورثا کو وہ صرف ۵ ہزار روپیہ سالانہ ادا کریں یہ تقسیم اس طرح ہوئی مبلغ ایک ہزار پانچ سو روپے، نصراللہ بیگ خان کی والدہ اور بہنوں کو ۱۵۰۰ روپے مرزا غالب اور مرزا یوسف کو بقایا دو ہزار مرزا حاجی کو دے دیئے، غالب کا کہنا تھا کہ مرزا حاجی ان کے خاندان کا ملازم تھا۔ اس لئے نصراللہ بیگ خان کی پنشن میں اس کا کوئی حق نہیں بنتا تھا۔

۱۸۰۷ء غالب کی شاعری کا آغاز ہو چکا تھا۔

۹ اگست ۱۸۱۰ء کو غالب کی شادی مرزا الٰہی بخش خان معروف کی دختر امراؤ بیگم سے انجام پائی۔

۱۸۱۱ء غالب نے خلیفہ محمد معظم اور مشہور شاعر نظیر اکبرآبادی سے درسیات کی کتابیں پڑھیں۔

۱۸۱۷/۱۸۱۸ء غالب آگرہ سے نقلِ مکانی کر کے دہلی آ گئے۔

۱۸۱۹/۱۸۱۸ء غالب کو ایک ڈومنی سے کمال درجہ عشق ہو گیا اس ڈومنی نے خودکشی کر لی اس حادثے نے ان کی شاعری کا لب و لہجہ

بدل دیا۔

۲۹ر اکتوبر ۱۸۲۲ء نواب احمد بخش خان نے اپنی جاگیر فیروز پور جھرکا کا وارث شمس الدین خان کو قرار دیا۔ نواب کے دو بیٹوں امین الدین احمد خان اور نواب ضیاء الدین احمد خان اور نیرو درخشاں کو لوہارو کی جاگیر ملی، نواب احمد بخش ۱۳ر اکتوبر ۱۸۲۶ء میں دست بردار ہوگئے۔

۱۸۲۶ء غالب کے خسر نواب الٰہی بخش خان معروف کا انتقال ہوگیا۔

عرصہ دو تین سال کے دوران غالب شدید مالی مشکلات کا شکار ہوئے اس تمام عرصہ میں وہ اپنی پنشن کے متعلق نواب احمد بخش خان سے درخواستیں کرتے رہے جو نواب مرحوم بڑی چالاکی سے ٹالتے رہے آخر انہیں ایسٹ انڈیا کمپنی کی صدر عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانا پڑا وہ بنفس نفیس اپنی درخواست لے کر کلکتہ گئے، وہ

۲۰ر فروری ۱۸۲۸ء کو کلکتہ پہنچے۔

۲۸ر اپریل ۱۸۲۸ء کو غالب نے گورنر جنرل کی خدمت میں اجرائے پنشن کی درخواست پیش کی وہ کلکتہ میں ۲ برس مقیم رہے۔ اور ۲۸ر نومبر ۱۸۲۹ میں بے نیل و مرام واپس دہلی لوٹے۔

۲۳ر مئی ۱۸۳۰ء غالب کے مشفق دوست اینڈریو اسٹرلنگ کا انتقال ہوگیا۔

۱۸۳۴ء امین الدین خان غالب کے تعارفی خطوط لے کر کلکتہ گئے۔

۱۸۳۵ء غالب تقریباً پینتیس ہزار روپے کے مقروض ہوگئے ان کی قرقی ہوئی اور وہ گرفتار ہونے کے ڈر سے خانہ نشین ہوگئے وہ صرف رات میں چھپ چھپا کر دوستوں سے ملنے کے لئے نکلتے تھے۔

۲۲ر مارچ ۱۸۳۵ء انگریز ریزیڈنٹ دہلی جو غالب کے دوست بھی تھے ایک شخص کریم خاں کے ہاتھوں قتل ہوئے کہا جاتا ہے کہ کریم خان کو نواب شمس الدین احمد خان نے فریزر کے قتل کی ترغیب دی تھی۔

۱۸ر اپریل ۱۸۳۵ء فریزر کے قتل کی پاداش میں نواب شمس الدین احمد خان کی گرفتاری اور پھانسی۔

۱۶ر دسمبر ۱۸۳۵ء غالب نے پنشن کے لئے ایک اور معروضہ لفٹیننٹ گورنر کے حضور پیش کیا۔

۱۸ر جون ۱۸۳۶ء غالب کی پنشن کے مقدمے کا فیصلہ ان کے موافق نہ ہوا تو ۱۳ر نومبر ۱۸۳۶ء کو انہوں نے ایک اور معروضہ حکام کو پیش کیا۔

۱۸۳۷ء اکبر شاہ ثانی کا انتقال ہوا اور بہادر شاہ ظفر تخت نشین ہوئے۔

۱۸۴۰ء دہلی کالج میں غالب کو فارسی کی پروفیسری کی اسامی پیش کی گئی لیکن اپنی طبعی خودداری اور نازک مزاجی کے سبب انہوں نے اسے قبول نہ کیا۔

۱۸۴۲ء ایسٹ انڈیا کمپنی کے کورٹ آف ڈائرکٹرز نے غالب کی پنشن کا مقدمہ کلی طور پر خارج کردیا۔

۱۸۴۷ء غالب کو قمار بازی کے الزام میں گرفتار ہوئے دوصد روپیہ جرمانہ ہوا وہ چھ ماہ تک جیل میں رہے۔ غالب کی رہائی کے لئے بہادر شاہ ظفر نے حکام سے سفارش کی مگر انہوں نے کوئی توجہ نہ دی۔ دوران اسیری نواب مصطفےٰ خان شیفتہ نے ان کی بڑی اعانت کی، اور آخر چھ ماہ کے بعد وہ رہا کر دیئے گئے ۴ر جولائی۔ ۱۸۵۰ء غالب شاہ ظفر کے دربار میں باریاب ہوئے انہیں خاندان تیموریہ کی تاریخ لکھنے کا کام سپرد ہوا نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ بہادر کا خطاب عطا ہوا۔

دسمبر ۱۸۵۱ء غالب نے مرزا کامران بخت کا مشہور سہرا لکھا اس میں ایک سخن گسترانہ بات استادِ شہہ ذوق کی ناراضگی کا موجب ہوئی اور غالب کو اس کی معذرت کرنی پڑی۔

اپریل ۱۸۵۲ء غالب کے متبنیٰ فرزند مرزا زین العابدین خان عارف کا انتقال ہوا ان کے دو بیٹوں باقر علی خان حسین علی خان کی پرورش اپنے ذمے لے لی۔

۱۳ر مئی ۱۸۵۲ء غالب کے دوست حکیم مومن خان مومن کا انتقال ہوا۔

۱۶ر نومبر ۱۸۵۴ء شاعر دربار شیخ ابراہیم ذوق کا انتقال ہوا اور ان کی جگہ غالب کو بادشاہ کے کلام کی اصلاح کا کام سونپا گیا۔ اس دوران ولی عہد سلطنت مرزا فخرو اور مرزا خضر سلطان ان کے شاگرد بنے، واجد علی شاہ نے غالب کو ۵۰۰ روپیہ سالانہ

وظیفہ دینا منظور کیا مگر یہ وظیفہ انہیں ملا نہیں۔

۱۰ جولائی ۱۸۵۴ء مرزا فخرا انتقال کر گئے۔

۵ فروری ۱۸۵۷ء رامپور کے نواب یوسف علی خان ناظم نے اپنا کلام غالب کے پاس اصلاح کے لئے بھیجنا شروع کیا۔

۱۱ مئی ۱۸۵۷ء میں کمپنی کی حکومت کے خلاف بغاوت ہو گئی بہادر شاہ کو باغیوں نے شہنشاہِ ہندوستان تسلیم کر لیا۔

۵ اکتوبر ۱۸۵۷ء

غالب کے بھائی مرزا یوسف جن کا توازن دماغ درست نہ تھا گھر سے نکلے تو کمپنی کے فوجیوں نے انہیں گولی کا نشانہ بنا ڈالا۔

۲۲ جنوری ۱۸۵۹ء

غالب اپنے دوست نواب مصطفٰی خان شیفتہ سے ملنے میرٹھ گئے نواب صاحب کو بجرم بغاوت گرفتار کر لیا گیا۔ مگر ۱۸۵۹ء میں رہا ہو چکے تھے۔ یہ بڑی ابتری اور کسمپرسی کا وقت تھا۔ دہلی اجڑ چکی تھی، شرفا اور علما کوڑیوں کو محتاج ہو چکے تھے اور مسلمانوں سے بُری طرح انتقام لیا جا رہا تھا۔

جولائی ۱۸۵۹ء نواب یوسف علی خان والئی رامپور نے غالب کی سد معاش کے لئے سو روپیہ ماہانہ وظیفہ مقرر کیا۔

۱۹ جنوری ۱۸۶۰ء۔ غالب رامپور گئے اور ۲۴ مارچ ۱۸۶۰ء کو دہلی واپس آئے۔

۲ مئی ۱۸۶۰ء غالب کی ضبط شدہ پنشن کا اجرا ہوا۔ ۱۸۶۲ء علامہ فضل حق مشفق و مربی و قبلہ انام غالب کا جزیرہ انڈمان میں حالت اسیری میں انتقال۔

۷ نومبر ۱۸۶۲ء آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر نے حالت اسیری میں رنگون میں انتقال کیا۔

۲۱ اپریل ۱۸۶۵ء والئی رام پور نواب یوسف علی خان ناظم انتقال فرما گئے اور نواب کلب علی خان تخت نشین ہوئے۔

۷ اکتوبر ۱۸۶۵ء غالب، نواب کلب علی خان کی تخت نشینی کے جشن میں شرکت کے لئے رامپور تشریف لے گئے۔

۸ جنوری ۱۸۶۵ء غالب رامپور سے دہلی واپس لوٹے۔

فروری ۱۸۶۷ء میں غالب نے اکمل الاخبار اور اشرف الاخبار میں اس مضمون کا ایک مراسلہ شائع فرمایا کہ ان کے دوست اور شاگرد اب اصلاح کے لئے انہیں اپنا کلام بھیجکر شرمندہ نہ کریں تا طاقتی اور کبر سنی کے باعث وہ اس بوجھ کے متحمل نہیں۔

۱۵ فروری ۱۸۶۹ء

چمن نغز کا یہ چہکتا ہوا بلبل ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔ میر مہدی مجروح الطاف حسین حالی اور دوسرے شعراء نے مرثیے اور قطعاتِ تاریخ وفات کہے۔

۴ فروری ۱۸۷۰ء کو غالب کی بیوی امراؤ بیگم انتقال کر گئیں۔

۲۵ مئی ۱۸۷۶ء مرزا زین العابدین خان عارف کے صاحبزادے باقر علی خان بعمر ۲۱ سال انتقال فرما گئے فارسی میں وہ باقر اور اُردو میں کامل تخلص کرتے تھے۔

۷ ستمبر ۱۸۷۰ء میں باقر علی خان کے چھوٹے بھائی حسین علی خان انتقال فرما گئے۔

وہ اُردو شاعری میں شاداں اور فارسی میں خیالی تخلص کرتے ہیں۔

(ترجمہ تلخیص از پاکستان کوارٹرلی)

سوانحی خاکہ — سید مظفر حسین رزمی

(خود نوشت)

قدیم ہندوستان کا مشہور تاریخی شہر پاٹلی پتر جو دریائے گنگا کی زرخیز وادی میں واقع تھا مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد کے بعد عظیم آباد کے نام سے مشہور ہوا۔ آج کل یہ شہر پٹنہ کہلاتا ہے اور ہندوستان کے صوبۂ بہار کا دارالحکومت ہے۔ یہ علاقہ صرف زرخیز ہی نہیں بلکہ ہر دور میں مردم خیز بھی رہا ہے۔ مجھے یہ شرف حاصل ہے کہ میں اسی شہر کے ایک نواحی گاؤں پیلاواں میں ۲۲ جنوری ۱۹۲۴ء میں پیدا ہوا۔

میرے والد سید ظہور الحسن رمتہ اللہ علیہ عالم دین اور قادر الکلام شاعر تھے۔ وہ اپنی زمینداری کی دیکھ بھال کے ساتھ ساتھ درس و تدریس کے پیشے سے بھی منسلک رہے۔ انہوں نے بڑی شفقت اور توجہ سے میری تعلیم و تربیت کی۔ ان کی وجہ سے اس زمانے کے پٹنے کی مشہور شخصیتوں سے ملنے، ان کو قریب سے دیکھنے، ان کی باتیں سننے اور ان سے فیض حاصل کرنے کا موقعہ ملا — جناب نجم ندوی، ملک ظہمہ فکری۔ مولانا نسیم بہاری، پروفیسر صبا رشیدی، پرویز شاہدی، شاہ تقی الدین بلخی، علامہ جمیل مظہری، جناب سلطان احمد ایڈیٹر اتحاد، پروفیسر یوسف باطن بلخی، جناب رفیع بلخی، جناب ماہ منیر خاں، قاضی عبدالودود، عطا کاکوی، علامہ تمنا عمادی اور دفا براہی والد صاحب کے قریبی احباب میں شامل تھے۔ اُس زمانے کے ہندوستان کی ایک مشہور شخصیت مولانا آزاد سبحانی میرے والد کے اُستاد تھے اور کبھی کبھار گھر پر تشریف لاتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب آزادی کی تحریک پورے شباب پر تھی۔ والد صاحب نے ترکِ موالات کی تحریک میں حصہ لیا بعد میں مسلم لیگ کی تنظیم و حمایت کے لئے بڑھ چڑھ کر کام کیا۔ ان دنوں پٹنے کے اخبارات و رسائل میں ان کی ملی اور سیاسی نظمیں بڑے نمایاں انداز میں شائع ہوتی تھیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ شاعری کے علاوہ جذبۂ حریت اور کسی حد تک سیاسی شعور سے بھی آشنا ہوا بعد میں سماجی مسائل اور انسانی فطرت کو سمجھنے اور اس کا علم حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ ۱۹۴۷ء میں جذبۂ آزادی کی خاطر سب سے پہلی اور سب سے بڑی قربانی اسی علاقے کے مسلمانوں نے دی۔ نتیجتاً قیام پاکستان کے بعد ہمارا بچا کھچا قافلہ ہجرت کر کے مشرقی پاکستان پہنچا جہاں سقوطِ ڈھاکہ تک میں قیام پذیر رہا۔

میں نے اعلیٰ تعلیم کے تمام مراحل ڈھاکہ ہی میں طے کئے۔ جن حادثات و حالات میں زندگی کے بہترین زمانے گذرے اس کی تفصیل بے فائدہ ہے۔ میں اپنا افسانہ سنا کر کسی کی نیند کیوں خراب کروں — مختصر یہ کہ مختلف سرکاری محکموں میں ملازمت بھی کرتا رہا اور تعلیم بھی حاصل کرتا رہا۔ ایم۔ اے کرنے کے بعد بہت سے سرکاری اور غیر سرکاری کالجوں میں درس و تدریس سے وابستہ رہا۔ بنیادی طور پر پڑھنا پڑھانا میرا پیشہ بھی ہے اور مشغلہ بھی۔

۱۹۷۴ء میں جب خون کے دریا سے گذر کر اسلام آباد پہنچا تو کچھ عرصہ فیڈرل گورنمنٹ کالج سے وابستہ رہا پھر چین جانے کا موقعہ ملا۔ وہاں تقریباً دو سال فارن لینگویج پریس میں خدمات انجام دیں واپسی کے بعد میری تقرری وزارت تعلیم میں بحیثیت اسسٹنٹ ایجوکیشن ایڈوائزر ہوئی جہاں تاحال کام کر رہا ہوں۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا دریائے گنگا کی سرزمین میں پیدا ہوا اور وہیں سنِ شعور تک پہنچا اس کے بعد وادیٔ برہم پترا (جہاں مشرقی پاکستان آباد تھا) میں ذہن و شعور میں پختگی پیدا ہوئی۔ ان دونوں علاقوں

Scanned by CamScanner

کی گہری چھاپ میری زندگی، میرے شعور، میری فکر اور میرے مزاج پر موجود ہے۔ جہاں گنگا کی لہروں نے میرے شعور کو بالیدگی اور ذہن کو تیز رفتاری سکھائی وہاں برہم پترا کی موجوں نے حسن و جمال اور ساز و آواز کے رموز و کنائے مجھ پر فاش کئے۔ لہروں کی موسیقی اور موجوں کی گنگناہٹ کا میں زندگی بھر اسیر رہا۔ میرے الفاظ، مصرعے اور اشعار اس کے ثبوت میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔ شاعرزادہ تو تھا ہی پھر جو ماحول ملا اس میں شعر و ادب کو معیارِ شرافت سمجھا جاتا تھا — ہماری تہذیب اور ہمارے کلچر کا یہ ایک بنیادی اور لازمی حصہ تھا۔ اسکول کی طالب علمی ہی کے زمانے میں نظمیں گنگنانے، مصرعے جوڑنے اور قافیہ پیمائی کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ لیکن قبل اس کے کہ میں اپنی شاعری کی ابتدا، اور ارتقا پر کچھ معروضات پیش کروں، سابقہ مشرقی پاکستان میں اُردو کی صورتِ حال کا ذکر ضروری ہے، ہر چند مشرقی پاکستان تاریخ کے کسی دور میں بھی اُردو سے نامانوس نہ تھا مگر یہ وہاں کے باشندوں کی مادری زبان نہ تھی اُردو سے اُن کی دلچسپی مذہبی اور تہذیبی رشتوں کی مرہونِ منت تھی مگر قیامِ پاکستان کے بعد بعض سیاسی و معاشی عوامل و وجوہ کی بنا پر اُردو بنگالی زبان کی حریف سمجھی جانے لگی اور عوام میں اپنی حوصلہ مندی و خود غرضی کی تحصیل و تکمیل کے لئے بعض رہنماؤں نے اُردو کے متعلق بہت سی غلط بیانیاں اور غلط فہمیاں پھیلائیں اس کا ازالہ ضروری تھا اور اُردو ادب کی ترویج و اشاعت کی جس قدر ضرورت مشرقی حصے میں تھی مغربی حصے میں نہیں۔ اس کا مجھے شدید احساس تھا چنانچہ اس سلسلے میں وہاں جو کچھ اجتماعی طور پر کیا جا رہا تھا اس میں بھی اپنی بساط بھر معاونت کرتا رہا اور نجی طور پر بھی اپنے محدود وسائل کے باوجود کوشاں رہا اُردو بنگلہ آرٹ سوسائٹی کا قیام پاکستان کانس من سنگھ میں اُردو کلاسوں کا اجرا، بزمِ فنون کا قیام، مشاعرے مذاکرے، ریڈیو پر یکجہتی اور باہمی ہم آہنگی کے لئے فیچر لکھنا میری کوششوں کے سلسلے کی کڑیاں تھیں جو ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو چکیں اور انجام کار اس باب میں ساری اجتماعی اور انفرادی کوششیں نقش بر آب ثابت ہوئیں جس سے المیۂ سقوطِ ڈھاکہ کی شدت ہمیشہ محسوس کی جائے گی۔ ڈھاکے میں اسی صورتحال میں میری شعر گوئی کے پہلو بہ پہلو میری "انجمن آرائی" بھی چلتی رہی۔ غریب خانے پر سال میں کئی بار شعری نشستوں کا اہتمام کرتا جن میں مقامی اربابِ شعر و ادب کے علاوہ بھارت سے آئے ہوئے بعض نامور شعرا نے بھی شرکت کی ہیں ادبی موضوعات پر وقتاً فوقتاً مقالے بھی لکھتا رہا ہوں۔ جو ملک کے رسائل میں شائع ہوئے اور پسند کئے گئے۔ اب کچھ اپنی شاعری کے بارے میں۔ میری شاعری کی باضابطہ ابتدا ڈھاکے میں ہوئی۔

اس سلسلے میں مَیں اپنے دوست اور بزرگ افسر ماہ پوری کا خاص طور پر ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ وہ عجیب و غریب شخصیت کے مالک ہیں، نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پرواہ کے مصداق۔ ڈھاکہ کی تمام ادبی سرگرمیوں کی وہ روحِ رواں تھے۔ ان کے بغیر کوئی مشاعرہ، کوئی مذاکرہ، کوئی نشست اور کوئی تقریب مکمل نہیں ہوتی تھی۔ مجھے شروع ہی سے ان سے قربت حاصل رہی۔ میرے اندر انہوں نے اعتماد اور حوصلہ پیدا کیا۔ وہ بے پناہ صلاحیتوں کے آدمی ہیں۔ ان سے میں نے جتنا فیض حاصل کیا کسی اور سے کم ہی کیا ہے۔ ابتداً تو میری ہمت بڑھانے میں جناب اقبال عظیم صاحب جو میرے ہم پیشہ تھے کا نام نامی بھی ذکر کے قابل ہے۔ میں علامہ جمیل مظہری کا بھی سپاس گذار ہوں جن سے سقوطِ ڈھاکہ کے بعد طویل ملاقاتیں رہیں اُن سے اپنے مجموعے "گرمئ بازار" کی ترتیب میں ہمت افزائیاں اور بیش بہا مشورے ملے انہوں نے ازراہِ نوازش "گرمئ بازار" کا پیش لفظ بھی لکھا تھا مگر چند اسباب سے یہ مجموعہ اشاعت پذیر نہ ہو سکا۔

میں اسے اپنی خوش قسمتی تصور کرتا ہوں کہ مجھے بہترین اساتذہ میسر آئے۔ خاص طور پر ڈاکٹر عندلیب شادانی سے مجھے کسبِ فیض کا موقع ملا۔ دنیائے ادب میں وہ ایک سخت گیر نقاد اور سراپا جمالیاتی شاعر کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ کسبِ ہنر کا سلسلہ بڑا طویل ہے۔ تلاش جستجو کا سفر کبھی ختم نہیں ہوتا۔ دامنِ طلب اب بھی ناآسودہ ہے۔ بہر حال سفر جاری ہے یم بہ یم، دریا بہ دریا، جو بہ جو۔

میری شاعری کا بڑا حصہ غزلوں پر مشتمل ہے۔ میں بنیادی طور پر غزل کا شاعر ہوں۔ غزل کے بعد جس صنف سے مجھے زیادہ دلچسپی ہے وہ رباعی ہے۔ یوں تو میں نے مختلف موضوعات پر بہت سی نظمیں بھی لکھی ہیں لیکن ان سے مکمل طور پر مطمئن نہیں ہوں۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ میری شاعری کا دوسرا دور نظموں کا دور ہو۔ اس سلسلے میں فی الحال کچھ کہنا ممکن نہیں۔

جہاں تک میری شاعری کی قدر و قیمت کا تعلق ہے اس سلسلے میں صرف اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میں نے ریت پر بہت کچھ نقوش بنائے ہیں۔ یہ نقوش میرے ہی ہاتھوں بنتے بگڑتے رہتے ہیں بننے بگڑنے کا عمل جاری ہے۔ کچھ نہیں کہہ سکتا کہ ہر گرد سیلاب کی زد میں آنے کے بعد یہ نقوش مٹ جائیں گے یا باقی رہیں گے، شاید کوئی لکیر، کوئی زاویہ کوئی نقطہ باقی رہ جائے، شاید کچھ بھی باقی نہ رہے۔

اللہ بس باقی ہوس۔

رزمی کی شاعری پر ناقدین کے تاثرات

رزمی صاحب کی شاعری اُن کے ذاتی تجربات سے پیدا ہوئی ان کے تخیل نے ان تجربات میں شعریت کا رنگ بھرا ہے لیکن اُن کی علامات اور استعارے بہت بڑی حد تک روایتی ہیں۔ وہ اپنی زبان کی زندہ روایت سے استفادہ کرتے ہیں اور انہیں اپنے تجربے کے اظہار کے لئے استعمال میں لاتے ہیں تاہم بعض ایسے اشعار اچانک نمودار ہو جاتے ہیں جنہیں ذاتی تجربے کو ذاتی اظہار کا رنگ مل جاتا ہے۔ ایسے اشعار ان کی غزلوں میں جا بجا بجلی کی طرح چمک اُٹھتے ہیں جس سے پوری فضائے غزل منور ہو جاتی ہے۔ رزمی صاحب اگر میرے قابو میں آجائیں تو میں انہیں پانچ سال کے لئے کوئی بھی روایتی لفظ استعمال کرنے سے روک دوں خواہ وہ بعد میں انہیں دوبارہ اپنے فن کا حصہ بنالیں۔ رزمی صاحب میں نئی طرح محسوس کرنے اور نئی طرح اظہار کرنے کی پوری صلاحیت ہے وہ اگر صلاحیت سے فائدہ اُٹھائیں تو ان کی شاعری میں اُن کے ذاتی تجربات کا رنگ اور زیادہ نمایاں ہو سکتا ہے۔

سلیم احمد

مظفر حسین رزمی شاعر بھی ہیں اور شاعر زادے بھی۔ ان کے والد مرحوم رمز کسمڈمی کلاسیکی روایت کے ایک قادر الکلام شاعر تھے۔ اُردو کے روایت پسند شعرا کی طرح بنیادی طور پر وہ غزل کے شاعر تھے لیکن نظمیں لکھنے پر بھی قدرت رکھتے تھے۔ رزمی کو اُردو شاعری کی کلاسیکی روایت کے مطابق شعر گوئی کا ذوق، غزل کی طرف فطری جھکاؤ اور وقتاً فوقتاً نظم نگاری کا شوق نہ صرف اپنے والد سے ورثے کے طور پر ملا ہے بلکہ اپنے اُستاد ڈاکٹر عندلیب شادانی کے فیض یا فیضان کے طور پر بھی چنانچہ اُردو شاعری کی کلاسیکی زبان اور اُس کے اسالیب اُن کی شاعری میں یوں ملتے ہیں جیسے ہر انسان کے خون میں خاندانی خصوصیات۔ ویسے رزمی نے اپنے معاصرانہ ماحول سے بھی بہت کچھ سیکھا ہے اور سیکھتے چلے جا رہے ہیں۔ ان کی غزلوں کا مجموعہ 'خواب کی ریت' قدیم تغزل اور جدید تجربے کا ایک خوشگوار امتزاج ہے۔ اگر زبان و بیان کے معاملے میں وہ بالکل جدید نہیں ہیں تو موضوعات و مسائل کے اعتبار سے وہ بالکل قدیم بھی نہیں ہیں۔ ان کے یہاں نئے نئے تجربے کا میلان یقیناً نہیں ہے۔ اس کا کم از کم ایک فائدہ تو انہیں ضرور ہی پہنچا ہے۔ وہ یہ کہ ان کی شاعری ناشاعری (اینٹی پوئٹری) بننے سے بچ گئی ہے۔ اُن کے بہت سے ہم عمر معاصرین نے شاعری کو نہ صرف ناشاعری بنا دیا ہے بلکہ شاعری کی بجائے کلامِ موزوں پر قناعت کر لی ہے۔ رزمی کی شاعری میں شاعری اور کلامِ موزوں کے درمیان کوئی نہ کوئی حدِ فاصل باقی رہتی ہے۔ ابھی ان کی شاعری میں جانی پہچانی لذتوں کے عناصر زیادہ ہیں۔ وہ جس قدر نامانوس لذتوں کو مانوس بنانے میں کامیاب ہوتے جائیں گے اسی قدر ان کی انفرادیت نمایاں ہوتی جائے گی۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے آپ کو اپنے زمانے کی شاعری میں ڈوبنے سے بچائیں اور اپنی ذات میں ڈوب کر شعر کہتے رہیں۔ انہیں گفتار کے اسلوب پر قابو حاصل ہے۔ اس قابو سے وہ بہت سے اچھے کام لے سکتے ہیں۔

نظیر صدیقی، اسلام آباد

خواب کی ریت

رئیس امروہوی

جناب مظفر حسین رزمی کے کلام کا مطالعہ کرتے ہوئے ان کا یہ شعر میری مسلسل راہنمائی کرتا رہا ہے کہ

چند غزلیں میں نے کہی ہیں اسی اُمید پر
بارِ دل اپنا کوئی دردآشنا لے جائے گا

حقیقت یہ ہے کہ بارِ دل یا غبارِ خاطر کی تسکین و تطہیر کا واحد ذریعہ شعر ہے۔ شعر کے روپ میں شاعر کی شخصیت کے تمام پہلو۔ تمام تہیں۔ تمام پرت اور تمام اطراف شعور کی سطح پر نمایاں ہو جاتے ہیں اور اس طرح نغمہ خوانی سے تکلیفِ حیات میں کسی قدر کمی ہو جاتی ہے۔

نغمے سے ہر چند کہ گھٹ جاتی ہے تکلیفِ حیات
نغمہ خوانی کی بھی حد ہے نغمہ خواں کب تک رہوں؟

جناب رزمی کی غزل اپنے مسلّمہ روایتی اسلوب کے باوجود (اور اِس اسلوب کو اختیار کئے بغیر غزل میں تغزل کی کیفیت نہیں پیدا ہوتی)، ان کی حقیقی نفسیاتی کیفیت سے لبریز ہے یعنی اُن کے کلام کے مطالعے سے بیک نظر اندازہ ہو جاتا ہے کہ شاعر نے یہ شعر موزونیٔ طبع کے بل بوتے پر نہیں کہے۔ بلکہ کچھ ایسے نفسی جذباتی تقاضے ہیں جنہوں نے شاعر کو شعر کہنے پر مجبور کر دیا ہے یعنی اِس کلام میں آورد کی نہیں، آمد کی کیفیت ہے یعنی شعر خود خواہشِ آں کرد کہ گردد فنِ ما۔

رزمی کے کلام کی جذباتی فضا سوز و درد سے لبریز ہے اور یہ سوز و درد درآمد کردہ جنس نہیں بلکہ وہ سفرِ حیات میں جن سنگلاخ گھاٹیوں اور دشوار گذار مرحلوں سے گذرے ہیں۔ انہوں نے شاعر کی روح کو زخم خوردہ کر دیا ہے۔ یہ سفر اسقدر مشکل اور معروف کن تھا کہ وہ بعض اوقات شعر گوئی کی فرصت بھی نہ نکال سکے۔

یہ مشغلہ بھی چھین لیا روزگار نے
لے دے کے میرے پاس یہی شاعری تو تھی

اگر ہم اُن کے کلام کا گہری نظر سے مطالعہ کریں تو بہ آسانی ان کی روحانی سرگذشت اور نفسیاتی افتادِ طبع کو مرتب کر سکتے ہیں

کچھ سوچ کر ہی جانب دریا نہیں بڑھے
ورنہ ہمیں بھی پیاس تو تھی تشنگی تو تھی

تشنگی کے باوصف دریا کا رخ کرنا رزمی کی عملی زندگی کی ایک حقیقت ہے اور کیوں ہے؟ اس لئے کہ

دنیا نے جو طلب کیا وہ میں نہ دے سکا
تاویل کیا کروں کہ یہ بیچارگی تو تھی

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کس اندازِ نظر کے انسان ہیں۔ کلام کی تاثیر میں اندازِ بیان کا حُسن جو اضافہ کر دیتا ہے، اس سے ہر صاحب ذوق واقف ہے۔ رزمی کا اندازِ بیان بہت خوبصورت ہے۔ مضامین جس قسم کے الفاظ کا مطالبہ کرتے ہیں اگر شاعر کو وہ الفاظ میسر نہ آئیں تو شعر کی تاثیر میں محسوس کمی ہو جاتی ہے۔

رزمی کا ذوقِ سلیم اور مذاقِ صحیح جذبات کی لطافت اور گداختگی کے ساتھ الفاظ کی نزاکت اور نغمگی کا پورا احاطہ کرتا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

سہہ لیں گے ہنس کے وار۔ کوئی وار بھی تو ہو
دل کہ رہینِ لذّتِ آزار بھی تو ہو
ہر مدعی کے لب پہ ہو آشفتگی کا ذکر
رسوا مگر کوئی سرِ بازار بھی تو ہو

اور کیا خوب مطلع ہے کہ

رزمی سکوتِ شب میں صدا دے تو کون دے
بیٹھا ہوا کوئی پسِ دیوار بھی تو ہو

کہیں کہیں استعارات میں عجیب قسم کی ہر جستگی پیدا ہوتی ہے۔

سچ کو پابستہ حالات بناتے کیوں ہو
خواب کی ریت سے سورج کو چھپاتے کیوں ہو

خواب کی ریت بڑا پُر معنی کلمہ ہے اور اس پر معنی کلمے کی وضاحت اس طرح ہوتی ہے کہ

قیمت شیشہ گری سنگ زنی ٹھہری ہے
دقت جب یہ ہے تو آئینہ بناتے کیوں ہو

جہاں شیشہ گری پہ لوگوں کو سنگسار کیا جانے لگے تو وہاں بجز اس کے اور کیا چارہ کار رہ جاتا ہے کہ سورج کے منہ پر خاک ڈالنے کے لئے خواب کو بطور ریت استعمال کیا جائے درحقیقت یہ عصرِ حاضر کی منافقت اور دورنگی پہ غزل کی زبان میں (کہ لطافت بیان مجروح نہ ہو) بڑا پُر معنی طنز کیا گیا ہے۔ انداز بیان کا ایک اور نمونہ!

تمام صحن میں پیلا ہٹیں بکھیر گئی

خزاں کے ساتھ یہ سازش کوئی ہوا کی تھی

خزاں رسیدہ زرد پتوں کی بارش کو ہوا کی سازش
قرار دینا عصر حاضر کی روش کی طرف برمحل اشارہ ہے۔
رزمی مخلص انسان ہیں سادہ اور معصوم۔ اور ہر حقیقی شاعر
کی افتادِ مزاج اور طبیعت کی ساخت اسی طرح کی ہوتی ہے
اس فریبِ نفس نفاقِ ذہن اور دو رنگیٔ فکر کو برداشت
ہی نہیں کر سکتے۔ ان کے سارے کلام سے ان کی معصومیت
سادگی اور دردمندی جھلکتی ہے۔ ایسے لوگوں کی بطون
میں خیر و شر کی جو پیکار چھڑی ہوتی ہے اس کی شدت
کا اندازہ عام لوگ نہیں لگا سکتے۔ رزمی خود کہتے ہیں کہ

دل و دماغ کے اندر جو معرکہ ہے بپا
وہ معرکہ تو کسی طور سر کیا جائے

اس معرکے کو سر کرنے میں دردمند شاعر کی روح
ریزہ ریزہ ہونے لگتی ہے اور وہ دنیا سے بیزار
ہو کر پکار اٹھتا ہے کہ

خودی کو اپنا کبھی راہبر کیا جائے
خود اپنی ذات کے اندر سفر کیا جائے

خود اپنی ذات کے اندر سفر کرنے سے عجیب عجیب
انکشافات ہوتے ہیں۔ نئے نئے سوالات پیدا ہوتے
ہیں۔ طرح طرح کے اندیشوں سے ذہن دوچار ہوتا ہے

یہ کیسا سایہ لرزتا ہے دل کے آنگن میں
یہ کون ساتھ مرے دشت و در میں رہتا ہے
اڑا کے جڑ سے نہ لے جائے ان درختوں کو
وہ اک بگولہ جو اندھے سفر میں رہتا ہے

ذات کے اندر شاعر کا سفر جاری ہے اور ذہن شاعر مسلسل
پیش قدمی کر رہا ہے۔

رات رخصت ہوئی۔ بجتے ہیں گجر آگے چل
ہونے والی ہے تمنا کی سحر آگے چل
ہو سکے تجھ سے تو لے رختِ سفر آگے چل
کچھ سہارے تو ضروری ہیں مگر آگے چل

یہ سفر روح کا سفر اور یہ سیاحت ذہن کی سیاحت ہے

فکر کی آنکھ میں لرزاں ہیں منازل کتنے
روح کا ختم نہ ہو جائے سفر آگے چل

اس رنگ آلودہ دنیا میں شاعر کے ہمراہ کون ہے؟ کہتے ہیں
کہ:

لٹ چکی ہے خرد اعتبار جب اپنا
جنوں کو دل کا شریک سفر کیا جائے

اس عالم میں شاعر مشاہدہ کرتا ہے کہ

جس طرف دیکھئے خوں پیرہنی
کس کو اب کس کی قبا دی جائے
جسم کے لیے سفر میں رزمی
روح بیدار سلا دی جائے

شاعر جسم کے اس لمبے سفر میں نئے نئے تجربات
سے دوچار ہوتا ہے مثلاً

مے رنگیں سے ہے آلودہ قبائے تہذیب
کون برپا کرے ہنگامہ کہ محفل بھی نہیں

اس ہنگامے کا ایک رُخ یہ بھی ہے کہ

قاتل کو مسیحائی کا دعویٰ بھی بجا ہے
اس دورِ پُر آشوب میں ایسا بھی ہوا ہے
یہ پھول کھلے ہیں کہ مرا زخم کھلا ہے
گلشن میں جدھر دیکھئے مقتل کی فضا ہے
گردن زدنی ٹھہری ہے نا کردہ گناہی
اور کردہ گناہوں کی نہ پرسش نہ سزا ہے

غزل کی زبان میں اس دورِ پُر آشوب کی اس سے بہتر
تصویر کشی اور ترجمانی اور کیا ہوگی؛ رزمی روایات کے
نہیں۔ ہنگامہ ہائے حیات کے شاعر ہیں۔ ان کی نظر عہد
حاضر کی اس باطنی کشمکش کی طرف مرکوز ہے جو ایک
نئے فکری انقلاب کا پیش خیمہ ہوگی۔ انہوں نے بجا طور
پر یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ

جس دن سے کارواں کو ملے رہبرانِ نو
ان رہزنوں کی راہ زنی اور بڑھ گئی
بڑھنے لگا جو بخیہ گرانِ خرد کا ہاتھ
اہلِ جنوں کی جامہ دری اور بڑھ گئی

رزمی کی غزل میں فکر کے ساتھ جذبے کے امتزاج نے
عجب دلکش کیفیت پیدا کر دی ہے۔

خلشِ دل کا سبب یاد نہیں
پہلے کچھ یاد تھا اب یاد نہیں
یاد ہے روزِ جدائی لیکن!
کیسے گذری ہے وہ شب یاد نہیں

رزمی کے کلام میں جو پرسوزی۔ گداز اور دل باختگی کی
کیفیت پائی جاتی ہے اس کا سبب معروضی اور خارجی
نہیں، موضوعی اور داخلی ہے وہ کشمکشِ حیات کے ایسے
مرحلوں سے گذرے ہیں۔ جنہوں نے ان کے روحانی شعور
کو مجلا اور منور کر دیا ہے۔ ان کی غزل ہو یا نظم، قطعات
ہوں یا دوسری اصناف سخن۔ ہر جگہ ان کے لہجے کی نرمی
اور ملائمت اور جذبات کی شدت و وسعت نمایاں ہے۔
امید کہ یہ مجموعہ (خواب کی ریت) ہمارے سرمایہ تغزل
میں اضافے کا سبب ہوگا۔

کلامِ رزمی

دل پر جو ہے وحشت کا اثر کیوں نہیں لکھتے
یہ کس [illegible] سا ہے اعجازِ ہنر کیوں نہیں لکھتے

کیا گ[illegible]ی شبِ ہجر متاعِ دل وجاں پر
بیتا[illegible]یں جو تھا رقصِ شرر کیوں نہیں لکھتے

طے کیسے ہوئی دشتِ تمنا کی مسافت
کس رنگ میں گزرا ہے سفر کیوں نہیں لکھتے

لکھو کہ سحر آئی مگر رات نہ گزری
لکھنی ہی جو ٹھہری ہے خبر کیوں نہیں لکھتے

چہرے کے خدوخال تو لکھنا نہیں مشکل
اس شوخ کا اندازِ نظر کیوں نہیں لکھتے

وہ نازک پُرکار تھا غارت گرِ دل تھا
اس دست کو تم دستِ ہنر کیوں نہیں لکھتے

جس ڈر سے سراسیمہ رہا کرتے ہو ہر دم
شعروں میں کسی روز وہ ڈر کیوں نہیں لکھتے

اس خشک سے موسم کی مسیحائی کی خاطر
اے دوست کوئی مصرعۂ تر کیوں نہیں لکھتے

اس دور میں چونکانا بھی اک ندرتِ فن ہے
رزمیؔ کبھی دیوار کو در کیوں نہیں لکھتے

روگ ایسا کوئی پالا ہوتا
تاقیامت نہ ازالہ ہوتا

رُخ سے پردہ جو اٹھاتا کوئی
ایک عالم تہہ و بالا ہوتا

ہم بھی ہیں وقت کی زندہ تصویر
کوئی تو دیکھنے والا ہوتا

دل میں پیوست ہیں لاکھوں کانٹے
کوئی کانٹا تو نکالا ہوتا

کچھ تو دیتے صلۂ مہر و وفا
یوں بہر حال نہ ٹالا ہوتا

شہرِ دلدار میں گوشہ کوئی
نام سے مرے قبالہ ہوتا

اپنی تقدیر سنورتی جاتی
ڈول ایسا کوئی ڈالا ہوتا

ڈولتی دھرتی پہ رزمیؔ صاحب
آپ نے خود کو سنبھالا ہوتا

رہا باقی نہ تھا کچھ امتحاں کو
دُعا دیتے تھے میرِ کارواں کو

یونہی لرزاں نہیں تھا دل ہمارا
سمجھتے تھے نگاہِ مہرباں کو

زباں رکھتے ہوئے بھی بے زباں تھے
فقط تکتے رہے تھے آسماں کو

وہی اُن کی پُرانی بے وفائی
کہاں تک طول دیں ہم داستاں کو

جھکے پڑتے ہیں گیسو اُن کے رُخ پر
کہ جیسے شام ڈھک لے گلستاں کو

ابھی کچھ حوصلہ باقی ہے دل میں
کوئی للکار دے جورِ بتاں کو

بہاروں نے کیا ہے چاک داماں
عبث الزام دینا ہے خزاں کو

بھری ہے دوستوں سے بزم لیکن
ترستے ہیں محبت کی زباں کو

سماں سا بندھ گیا محفل میں رزمیؔ
خدا رکھے ترے حسنِ بیاں کو

بس کہ اک آئینہ خانہ ہے یہ دنیا اے دوست
جس طرف دیکھئے اپنا ہی ہے چہرا اے دوست

کون سمجھے گا تری زلفِ پریشاں کا مزاج
اپنے حالات میں ہر شخص ہے اُلجھا اے دوست

خود پرستی میں سبھی مست نظر آتے ہیں
کون اس دور میں ہوتا ہے کسی کا اے دوست

میرے جذبات کی دُنیا نے کوئی قدر نہ کی
میرے کردار کو سمجھا نہ زمانا اے دوست

ہر ملاقات پشیماں کا نتیجہ معلوم
پھر بھی کیوں تجھ سے ہے ملنے کی تمنا اے دوست

عشق اک مانگ ہے اک چاہ ہے دل کی لیکن
چاہتا کیا ہے سمجھ میں نہیں آتا اے دوست

تم سے نسبت کا بالآخر یہ نتیجہ نکلا
بن گیا سب کی نگاہوں میں تماشہ اے دوست

ہم ہوئے اور بھی دُنیا کی نظر میں ہلکے
تم کو آیا نہ محبت کا سلیقہ اے دوست

میں نے مانا کہ بُرا ہے مگر اتنا بھی نہیں
تم نے رزمی کو بہت دور سے دیکھا اے دوست

خامشی لفظ و بیاں سے کبھی بڑھ کر بولے
بے لہو چہرے پہ عکسِ کفِ دلبر بولے

رات بھر حشر سا برپا رہا دل کے اندر
دل کے باہر تھے جو طوفان وہ اندر بولے

دل کے آئینے میں اترے ترا چہرہ ترا عکس
شب کے سناٹے میں مجھ سے ترا پیکر بولے

کوئی ایسا بھی تو ہو جو مری تنہائی میں
مری آواز میں آواز ملا کر بولے

مری بیتاب نگاہوں کا بھرم رہ جائے
کوئی چہرہ کوئی سایہ کوئی منظر بولے

جب اکٹھے تھے تو سکتے کا سماں تھا طاری
چہرے بکھرے تو فضاؤں میں بکھر کر بولے

آج تک دہر میں ایسا کبھی دیکھا نہ سنا
کہ سکوتِ لبِ ساحل سے سمندر بولے

اپنی آشفتہ سری میں کبھی لکھو رزمی
اک غزل ایسی جو سینے میں اتر کر بولے

سپاہی

دارائے جہاں بت شکن عرصہ باطل
پیغامبرِ جنگ کبھی امن کا حامل
گرداب مماثل تو کبھی صورتِ ساحل
ہر ظلم کا ہر جور کا تو مدِ مقابل
روشن ہیں جہاں پر ترے اغراض و مقاصد اے مردِ مجاہد
کثرت کے تموج سے ہے لرزاں نہ ہراساں
قلت کے تصور سے نہ ہوتا ہے پریشاں
افسوں سے ترے ششدر و حیراں حدِ امکاں
فرعون کشی کے لئے تو موسیٰ عمراں
زیر و بم ہستی میں ہے تو غیرتِ خالد اے مردِ مجاہد
ظلمت کدۂ دہر میں تو نور کا مینار
صحرا کی کڑی دھوپ کبھی سایۂ دیوار
دشمن کے سروں پر ہے لٹکتی ہوئی تلوار
تو زیست کا پیغام ہے تو فرض کی للکار
تاریخ ترے کوہ شکن عزم کی شاہد اے مردِ مجاہد

نوجوانانِ ملت سے

صاحبِ عزم و عمل برہم کُن دورِ فتن
تم ہو تقدیرِ وطن تم سے ہے تقدیرِ وطن
روحِ افسردہ کو بخشا ہے ترنم زا چلن
تم سے تزئینِ گلستاں تم سے تنظیمِ چمن

دور ذہنِ کفر و دیں کی تیرگی تم سے ہوئی
چشمِ مہر و ماہ میں تابندگی تم سے ہوئی
تم سے روشن تر ہوئی صبحِ تجلی کی کرن
تم نے بخشی زندگی کو دلکشی اور بانکپن

تم نے یوں بدلا جہاں میں اعتبارِ فکر و فن
محو ذہنوں سے ہوئے نقشِ روایاتِ کہن
اک نیا جذبہ دیا تعمیر کو تخریب کو
اک مزاجِ نو ملا تزئین کو تہذیب کو

حُسن کے ہر باب کا تابندہ عنواں تم سے ہے
رفعتِ علم و یقین و دین و ایماں تم سے ہے
معرکے میں پرچمِ اقبالِ تاباں تم سے ہے
میکدے میں روحِ غالب کی غزل خواں تم سے ہے

عزم کے ہاتھوں میں تم اک تیشۂ تعمیر ہو
خواب ہائے ذہنِ نو کی بولتی تعبیر ہو
تم سے باطل سنتِ فرعون و سحرِ سامری
تم سے پائندہ جہاں میں حسن کی جلوہ گری

تم سے سنجیدہ مزاجی تم سے شوریدہ سری
کھیتیاں تم سے ہی دنیائے ثقافت کی ہری
توڑ دیں زنجیریں تم نے ارتقا کے پاؤں کی
اور بدلا دیں قسمتیں ہر دھوپ کی ہر چھاؤں کی

مجاہدِ ملت سے

اے مجاہد اے امین و رازدارِ کائنات
اے کہ تیرے عزم و ہمت سے جواں ہر دم حیات
اے کہ تیرے نور سے فروزاں شش جہات
اے کہ تیری جرأت و ہمت کا شاہد ہے فرات

کہہ رہے ہیں پھول زخمِ تیغ و زخمِ تیر کے
کہ ترے دل میں ہیں شعلے سینۂ شبیر کے

مجتمع تجھ میں جواں طبعی و پیرانہ سری
قدرتِ شیشہ گری و صنعتِ شیشہ گری
تیری ہیبت سے ہیں لرزاں آذری و قیصری
تیری سیرت آئینہ دارِ جلالِ حیدری

خاک میں تجھ سے ملی بنیادِ ایوانِ ستم
تو ہے تعبیرِ مشیت تو ہے تقدیرِ اُمم

اے مجاہد اے نقیبِ دینِ فطرت زندہ باد
مثلِ پروانہ فدائے شمعِ ملت زندہ باد
زندہ ہے تجھ سے مسلمانوں کی غیرت زندہ باد
زندہ باد اے نازبردارِ مشیت زندہ باد

تو جو زندہ ہے تو دل زندہ ہیں ایماں زندہ ہے
زندگی سے تیری تاریخِ مسلماں زندہ ہے

تیسرے درجے کا مسافر

صدیق راعی

جس طرح سفر کرنے کے مختلف ذرائع ہیں اسی طرح مسافروں کی بھی کئی ایک اقسام ہیں۔ ان میں سب سے اعلیٰ و ارفع قسم اُن مسافروں کی ہے جو ہوائی جہاز میں سفر کرتے ہیں۔ دوسری قسم موٹر کاروں میں سفر کرنے کو ترجیح دیتی ہے اور مسافروں کی تیسری قسم ریل گاڑی میں سفر کرنے والوں کی ہے اور آخر میں مسافروں کی وہ قسم ہے جو بس میں سفر کرتے ہیں۔ یہ لوگ بس میں سفر کرنے سے پہلے اپنے بزرگوں سے دُعائیں لیتے اور اُن سے اپنے بازوؤں پر امام ضامن بندھوا کر رختِ سفر باندھتے ہیں۔ اور بس میں جابجا لکھے ہوئے اِس فقرے کو پڑھ کر بس میں سفر کرنے سے پہلے اپنے گناہوں کی معافی مانگ لو شاید کہ تمہاری زندگی کا یہ آخری سفر ہو۔ سعادتمند بیٹوں کی طرح اپنے گناہوں کی معافی بھی مانگ لیتے ہیں اور ساتھ ہی نظیر اکبرآبادی کے اِس مصرع کا بھی ورد کرتے رہتے ہیں۔

ع سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا
جب لاد چلے گا بنجارہ

ریل گاڑی میں سفر کرنے والے بھی اپنے آپ کو تین درجوں میں تقسیم کر لیتے ہیں ان میں صاحبِ حیثیت لوگ تو ایئرکنڈیشنڈ اور فرسٹ کلاس میں سفر کرتے ہیں اور دوسرے تھرڈ کلاس میں سفر کرنے کو ترجیح دیتے یا پھر مجبوراً اِن درجوں میں سفر کرتے ہیں۔ گو آج کل ریلوے کے محکمے نے تیسرے درجے کو ختم کر کے اِس کا نام سیکنڈ کلاس رکھ دیا ہے مگر نام سے کیا فرق پڑتا ہے۔ یہ تقسیم تو جوں کی توں قائم ہے۔ اب رہے سیکنڈ کلاس کے مسافر یا یُوں کہیئے کہ اس تقسیم کے بعد فرسٹ کلاس کے مسافر تو وہ تین میں نہ تیرہ میں اُن کی اپنی ایک الگ کلاس ہے۔ دوسرے لوگوں کی طرح میں بھی گاہے بگاہے سفر کرتا رہتا ہوں۔

جیسے غالبؔ نے کہا ہے۔

ایک چکّر ہے میرے پاؤں میں زنجیر نہیں

اور اِسی نسبت سے میں بھی ایک مسافر ہوں۔ سیکنڈ کلاس میں سفر کر سکنے والا مسافر۔

میں جو ایک مسافر ہوں۔ سفید پوش ہوں۔ سیکنڈ کلاس کا کرایہ ادا کرنے کا متحمل ہوں لیکن تیسرے درجے میں سفر کرتا ہوں اور اب یہ میرا ہمیشہ کا معمول بن گیا ہے۔ یا یوں کہیئے کہ میں بھی گیان کی تلاش میں ہوں اور مجھے یہ گیان ریل گاڑی کے تھرڈ کلاس کے ڈبے میں ہی ملتا ہے۔

آپ جو جی میں آئے کہیں ۔۔۔ بات وہی کھری ہوتی ہے جو سچ کا چولا پہن کر کی جائے

مجھے بھی تھرڈ کلاس کے ڈبے کا نشہ سا ہو گیا ہے۔ اور اس نشے کے ساتھ ساتھ آرام اور ذہنی سکون بھی ملتا ہے۔ گو کہ میرا اکلوتا اٹیچی کیس جس میں میرے کپڑوں کے علاوہ اور بھی ضروری سامان تھا سفر کرتے ہوئے تھرڈ کلاس کے ڈبے سے ہی چوری ہُوا تھا۔ اور جس کا غم میں آج تک نہیں بھُلا سکا۔ لیکن اس کے باوجود تھرڈ کلاس کا ڈبہ ہی میرے لئے سب کچھ ہے۔

آپ کہیں گے کہ یہ عجیب منطق ہے کہ تیسرے درجے میں سیکنڈ کلاس کی نسبت زیادہ آرام اور ذہنی سکون ملتا ہے۔ جی ہاں۔ یہ سچ ہے۔

اِس لئے کہ میں ایک ایسے شہر میں رہتا ہوں جہاں دن رات۔ موٹر کاریں ٹیکسیاں اور بسیں چلتی رہتی ہیں جہاں پر شور اور دھوئیں کا غلبہ ہے اور میں اِس شور سے اس قدر مانوس ہو گیا ہوں کہ اِسے اب چھوڑ نہیں سکتا۔ دوسرا میں ایک مجلسی آدمی ہوں دوستوں کا حلقہ وسیع ہے لہٰذا گپ بازی کو زیادہ پسند کرتا ہوں یہی وجہ ہے کہ تنہائی اور سکون اب کاٹنے کو دوڑتے ہیں یہی وجہ ہے کہ تیسرے درجے میں بیٹھ کر تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے مَیں اپنوں میں

بیٹھا ہوں گپ بازی ہے۔ حقہ ہے۔ سگریٹ پیئے جا رہے ہیں۔ گھٹیا قسم کے سگریٹ۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ تیسرے درجے میں سفر کرنے والے کا ہمارے معاشرہ میں کوئی مقام نہیں۔ اس لئے انٹلکچول کی نظر میں اُس کی سوشل پست ہے وہ ہماری سوسائٹی کا ادنیٰ فرد ہے لیکن یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی میں تھرڈ کلاس میں سفر کرتا ہوں مگر میں خوش ہوں۔ مجھے تو یہاں گھر کا سا ماحول ملتا ہے کوئی اجنبیت نہیں۔ اپنائیت ہی اپنائیت۔ سکون اور آزادی انکساری اور عجز ہے۔ اور گپ بازی۔

اگر آپ چٹ کپڑے ہیں تو پھر عزت ہی عزت ہے۔ سلام ہی سلام۔ جس کی کہ ہر چٹ کپڑا خواہش کرتا ہے یہاں بیٹھکر آپ چاہیں جتنی بڑی بڑی ماریں وہ سچ سمجھی جائینگی

ریل گاڑی میں تھرڈ کلاس کا ڈبہ تو بھائی چارہ اور مساوات کا دبستان ہے۔ یہاں نہ تو بات کرنے پر کوئی پابندی ہے اور نہ ہی تھوکنے پر۔ سیاست سے لے کر مہنگائی تک اور پھر ایران عراق کی جنگ سے لے کر لبنان کی خانہ جنگی اور پولینڈ کے مسئلہ پر دل کھول کر تبادلہ خیالات کیا جاسکتا ہے۔ یہاں ڈبے میں داخل ہوتے ہی ہر آدمی آپ سے متعارف ہونے کا متمنی ہے اور ہر آدمی آپ کا سامان اُٹھانے کے لئے تیار بیٹھا ہے۔ بھری کے میٹھے بول میں۔ اور یہاں ہر ایک تمہارے دُکھ باٹنے کیلئے تیار ہے لیکن دوسری طرف تھرڈ کلاس میں لڑائی ہی لڑائی ہے۔ کوئی سیٹ کے لئے لڑ رہا ہے کسی کی سیٹ پر کوئی دوسرا مسافر آکر بیٹھ گیا ہے اور اب دونوں تو تو میں میں سے ذرا آگے نکل کر گالی گلوچ پر اُتر آئے ہیں اور پھر دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔

کسی کی جیب کٹ گئی ہے اور وہ آہ و زاری کر رہا ہے کسی کا جوتا گم ہوگیا ہے تو کسی کا سامان ہی پہلے اسٹیشن پر رہ گیا اور وہ اب ریلوے والوں کو کوس رہا ہے اور ساتھ ہی وہ اپنے دوسرے پڑوسی سے اس بارے میں مشورہ کر رہا ہے تو کوئی عجلت میں ٹکٹ لینا ہی بھول گیا۔ اور اب وہ سہما سہما سا گھبرایا ہوا بیٹھا ہے کہ کہیں ٹکٹ چیکر ہی نہ آجائے۔ کسی کی بیوی بیمار ہے اور وہ اُس کا رونا رو رہا ہے کسی کا لڑکا پڑھ لکھ کر بیکار پھر رہا ہے اور وہ اپنے نالائق بیٹے کو کوس رہا ہے کوئی سسرال والوں سے تنگ ہے تو کوئی اپنے گھر والوں سے۔ کچھ اپنے آباؤ اجداد کے قصے لے کر بیٹھے ہیں تو کچھ مقدمہ بازی کی پیچیدہ گتھیوں کو سلجھا رہے ہیں۔ غرضیکہ تھرڈ کلاس میں زندگی ہی زندگی ہے۔ جیتی جاگتی زندگی۔ شور و لڑائی سے پُر زندگی۔ لیکن سیکنڈ کلاس میں تو سوچ ہی سوچ ہے۔ کلف لگی گردنیں ہیں۔ اخبار کا مطالعہ ہے۔ جھوٹی انانیت کا چولا ہے۔ جو ہر ایک نے پہن رکھا ہے۔ انا کی لاش ہے جو ہر سیکنڈ کلاس کا مسافر اپنے کندھے پر لادے بیٹھا ہے۔ ہر ایک اپنی ذات کے لوٹے میں گم ہے لوٹے کے اس پانی سے بھیگا ہوا ہے۔ لیکن کسی سے ذکر نہیں کرتا۔

یہاں تو خواب ہی خواب ہیں۔ جاگتے میں خواب دیکھ رہے ہیں۔ روشن مستقبل کے خواب۔ اپنی ترقی کے خواب کچھ اپنے افسرِ اعلیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے بارے میں سوچ رہے ہیں تو چند اپنے کاروبار چمکانے کی ترکیبوں میں گم۔ دوسرے اپنے حریفوں کو نیچا دکھانے کے درپے ہیں اور چند اپنے دشمنوں کی ناکامی کی دُعائیں مانگ رہے ہیں غرض یہاں ہر ایک اپنی سوچ میں گم ہے فضول نہ ختم ہونے والی سوچ۔ سوچ ہی سوچ۔

کوئی کسی سے بات نہیں کرتا۔ ہمدردی کا ایک لفظ بھی تو کوئی نہیں دُہراتا۔ لیکن کوئی دُہرائے کیسے ہر ایک اپنے اپنے دُکھ اپنی اپنی جھولی میں چھپائے بیٹھا ہے سیکنڈ کلاس کے ڈبے پر تو سوچ اور دُکھ کا قبضہ ہے اور ہر مسافر اس سوچ اور دُکھ کے ہاتھوں میں جکڑا بیٹھا ہے۔ سوچ اور دُکھ کی ان حدوں کو پاٹنا چاہتے بھی ہیں اور نہیں بھی۔ ان پر تو ایک نشہ طاری ہے اور اسی نشہ کی مستی میں مست ہیں۔

ان کی سوچیں اور دُکھ تو ان کے رومالوں سے بندھے ہیں اور ان کی جیبیں بھی تو سوچ اور دُکھ سے بھری ہوئی ہیں جب جی چاہا انہی یہ سوچ رومال سے کھول کر اپنے اُوپر طاری کر لیتے ہیں۔

یہاں کوئی بحث مباحثہ نہیں۔ کوئی تبادلہ خیال نہیں نہ تو سیاست پر اور نہ ہی مہنگائی پر۔ ان کی زبانوں پر تو چُپ کے تالے پڑے ہوتے ہیں۔ کوئی یہ تالے کھولے تو کیوں کر۔ ان میں تو اتنی ہمت ہی نہیں کہ یہ اپنے اپنے تالے کھول سکیں۔

اُوپر سیٹوں پر اُن کے بستر اور اٹیچی کیس رکھے ہوئے ہیں جن میں اُن کی سفید پوشی چھپی ہوتی ہے۔ اُن کے پہلوؤں میں ناشتہ دان ہیں۔ گاڑی کی کھٹ کھٹ کے علاوہ کوئی آواز اور شور نہیں۔

یہاں تو تکلف ہی تکلف ہے۔ وضعداری ہی وضعداری تھرڈ کلاس کے ڈبے کی طرح یہاں کوئی لڑائی جھگڑا نہیں۔ نہ سیٹ کیلئے اور نہ ہی کسی اور بات پر تکرار۔ یہاں نہ تو کسی کا جوتا گم ہوتا ہے اور نہ ہی سامان اور نہ ہی اپنے گھر بار کا ذکر کرتا ہے۔ سب نے چُپ رہنے کا ایکا کر رکھا ہے۔ سب انٹلکچول بنے بیٹھے ہیں۔ ہر ایک نے اپنے اپنے چہرے پر ذہانت کا نقاب پہن رکھا ہے۔ اور اس نقاب کی حفاظت کر رہا ہے۔ کہ کہیں یہ نقاب تیز ہوا سے اُڑ نہ جائے یا پھر

پسینہ آنے سے دُھل نہ جائے۔ شاید اسی وجہ سے وہ بولتے بھی نہیں کہ مُبادا ذہانت کا یہ خول ہی اُتر جائے اور پھر اندر سے اُن کے اصلی چہرے نظر آنے لگیں۔ چہرے جو انسان کی غمازی کرتے ہیں۔ لیکن یہ سب نہیں جانتے کہ اُن کے یہ نقاب وقت آنے پر خود بخود ہی اُتر جائیں گے اور اُن کا ظاہر و باطن دونوں نظر آنے لگیں گے یہ مُلمع اُتر جائیگا تو اندر سے اُن کا کھوکھلا پن نظر آنے لگے گا۔ اُس وقت جب یہ سب مسافر اپنے اپنے سٹیشنوں پر اُتریں گے تو اُس وقت اُن کی زبانوں پہ لگے ہوئے تالے بھی خود بخود ہی اُتر جائیں گے۔ قُلیوں سے مول تول کرتے ہوئے یا پھر ٹانگہ یا ٹیکسی کرایہ پر لیتے وقت "بولتے چلے جائیں گے اور چپ کرنے کا نام ہی نہ لیں گے۔ اُن کی سوچیں دُکھ اور ذہانت کے خول سب دھرے کے دھرے رہ جائیں گے اور اُن کے اصلی چہرے نظر آنے لگیں گے۔

اس کے برعکس تھرڈ کلاس کا مسافر ریل کے ڈبے میں تو بولتا۔ لڑتا جھگڑتا اور بحث میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا ہے لیکن جب وہ اپنی منزل پہ پہنچتا ہے تو یک لخت اُس کی زبان کو چُپ کا تالا لگ جاتا ہے اُس پہ سوچ طاری ہو جاتی ہے سٹیشن پر اُترتے ہی نہ تو وہ قُلی کو آواز دیتا ہے اور نہ ہی ٹیکسی یا ٹانگہ لینے کی خواہش کرتا ہے بلکہ چُپ چاپ اپنا سامان کندھے پر رکھ کر اپنے گھر کی جانب چل پڑتا ہے۔

میں جو کہ ایک مسافر ہوں۔ اپنا سفر طے کر کے سٹیشن پر پہنچ گیا ہوں۔ میں جو شور اور ہنگامے کو پسند کرتا ہوں لیکن مجھے اب سٹیشن پر برپا اس بھیڑ اور شور سے وحشت سی ہونے لگی ہے۔ میرے ایک ہاتھ میں اٹیچی کیس اور دوسرے ہاتھ میں ایک ٹوکری ہے جس میں بچوں کے لئے کھلونے اور پھل ہیں۔ میں اب اسی سوچ میں ہوں کہ کسی طرح جلدی سے سٹیشن سے باہر نکل کر گھر پہنچ جاؤں۔ گھر جہاں میری بیوی اور بچے میرا انتظار کر رہے ہیں۔ اسی سوچ میں اب سٹیشن سے باہر آ گیا ہوں۔ میرے اِردگرد رکشے اور تانگے ہیں دوسرے مسافر ہیں جو رکشے اور تانگے والوں سے کرایہ طے کر رہے ہیں۔ کرایے پر جھگڑ رہے ہیں۔ کچھ تانگے والے مجھے بھی آواز دے کر اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش میں ہیں لیکن میں تو اب خاموشی اور سکون چاہتا ہوں اور اسی خاموشی اور سکون کو اپنے اِردگرد لپیٹے پیدل ہی گھر کی طرف چل پڑتا ہوں۔

آپ اور تم

محمد حمید شاھد

روسی زبان میں کسی کو مخاطب کرنے کے لئے دو لفظ استعمال ہوتے ہیں تی (TTTG) یعنی تُم اور وی (BbI) یعنی آپ ـــ روس کا عربی النسل کالا شاعر پشکن کہتا ہے ـــ (سردِ ترحَم تی پوستوئے وی) "دل سے نکلا ہوا لفظ تم اور کھوکھلا لفظ آپ" ـــ لیکن واقعہ یہ ہے کہ مجھے پشکن کی یہ بات قطعاً پسند نہیں آئی ـــ "آپ" کے اندر ملائمت ہے، محبت ہے، پیار اور خلوص ہے عزت و احترام ہے جبکہ تم لفظ تو مخاطب تک یوں پہنچتا ہے جیسے کند خنجر ـــ

BRICE PARRAIN نے کہا تھا ـــ

"الفاظ بھرے ہوئے پستول ہوتے ہیں"۔ دیگر لفظوں کے بارے میں تو میں کچھ نہیں کہتا لیکن اتنا ضرور کہوں گا "تم" لفظ واقعی بھرا ہوا پستول ہے۔ یہ بھرا ہوا پستول اگر ایک طرف معصوم اور ننھے ننھے بچے اپنے والدین پر تانے اُن کے سینے داغے جارہے ہیں۔ تو دوسری طرف طالب علم اپنے روحانی باپ یعنی اُستاد کو نشانے پر رکھے ہوئے ہیں۔

"آپ" لفظ کے اندر تو ایک حُسن چھپا ہوتا ہے۔ جس میں موجود لطافت غیر محسوس انداز میں مخاطب پر سحر طاری کر دیتی ہے۔ اس میں بالکل ویسی ہی اثر انگیزی ہے۔ جیسی مصور کے شاہکار سے پھوٹ کر آنکھوں میں جا سماتی ہے ـــ ذرا ہونٹوں کو دیکھئے تھوڑی سی سانس اندر جانے دیجئے اب وہ تھوڑی سی ہوا جو آپنے ابھی ابھی پھیپھڑوں میں پہنچائی تھی آہستہ آہستہ خارج کرتے ہوئے ہونٹوں کو یوں مِل جانے دیجئے جیسے شگفتہ گلاب پر شبنم کے قطرے بوسہ دے دیتے ہیں اس عمل سے ایک بہت ہی پیارا لفظ جنم لے گا ـــ "آپ" ـــ اور اس کے ساتھ ہی آپ کے چہرے پر تازگی کی لہر دوڑ جائے گی ـــ لیکن دوسری جانب "تم" کہنے کا عمل آپ کے پورے وجود کو اذیت میں مبتلا کر دے گا آنکھوں کو تھوڑا سا بند کر کے، دونوں بھنوؤں کو سکیڑ کر، ہونٹوں کو آپس میں سختی سے ٹکرایئے یوں "تم" آپ کی زبان سے سیدھا مقابل کی سماعتوں کو گھائل کرتا اس کی کھوپڑی میں جا دھنسے گا۔

تجوید کی رو سے "ب" کی طرح "پ" کی ادائیگی کے وقت ہونٹوں کے اندر کے کنارے اور "م" کا حرف کہتے ہوئے بیرونی کنارے ملتے ہیں۔ اسی بات کو بنیاد بنا کر میں کہا کرتا ہوں کہ "آپ" لفظ کا تعلق انسان کے اندرونی جذبات اور دل کی گہرائیوں سے ہے جبکہ "تم" کا تعلق باطن کی بجائے محض ظاہر سے ہے۔

صوتی اثرات و آہنگ کے ساتھ ساتھ ایک اور بات جس نے مجھے "آپ" کے نزدیک اور "تم" سے دور کر دیا ہے وہ یہ دونوں لفظ استعمال کرنے والوں کی اندرونی کیفیات ہیں۔ ایک شخص جو انتہائی بلندی پر کھڑا اپنے سامنے پھیلے ہوئے انسانوں کو چیونٹوں کی مانند حقیر جانے اپنے آپ کو برتر اور دوسروں کو حشرات الارض سے بھی کم تر سمجھے وہ قطعاً "آپ" کا لفظ ادا نہ کر سکے گا اس لئے کہ اس لفظ سے کمتر انسانوں کی تکریم کا پہلو نکلتا ہے۔ جو قطعاً اُسے پسند نہیں ہوتا۔ جبکہ وہ شخص جو اپنی ذات کا "عرفان" پا چکا ہو۔ اپنے اندر کے انسان سے بالمشافہ ملاقات کر چکا ہو۔ دوسروں کی خامیوں سے صرفِ نظر کرتے ہوئے اُن کی خوبیوں کو اپنی نگاہوں میں بسا چکا ہو۔ اُس کے مَن میں دوسروں کے لئے پیار، محبت، عزت یہ سب کچھ بھرا ہوگا ایسے میں اُس کی زبان پر "تم" جیسا نا ملائم لفظ کیسے آسکے گا۔

پشکن کے ہمنوا کہتے ہیں "تم" کہنے سے تکلف کے پردے اُٹھ جاتے ہیں۔ اور یوں دل آزادی سے براہ راست مخاطب ہو سکتے ہیں ـــ لیکن کتنے نادان ہیں یہ لوگ ـــ جو یہ نہیں سمجھتے کہ "آپ" ہی تو وہ فاصلہ ہے۔ دو نازک برتنوں کے درمیان موجود ہے۔ ورنہ برتن آپس میں ٹکرا کر ٹوٹ پھوٹ نہ جائیں۔

جہاں تک دلوں کی آزادی سے گفتگو کا تعلق ہے۔ ایسا ضرور ہونا چاہیئے۔ میں خود اس کا حامی ہوں لیکن ۔ ع ۔

صنوبر باغ میں آزاد بھی ہے پا بہ گِل بھی ہے

آزادی سے مراد یہ نہیں کہ زبان اپنا لباس اُتار کر الف ننگی ہو جائے آہ ننگی حسین نہیں ہوتی کھٹکتی ہے۔ ہر آزادی چند پابندیوں کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ زنداں سے نکلنے والے شخص کے سامنے دنیا وسیع ضرور ہوتی ہے لیکن معاشرتی ذمہ داریاں اُس کے قدموں کی زنجیر بن جاتی ہیں۔ دل آزادی سے ملنا چاہیں تو شوق سے ملیں لیکن صنوبر کی طرح پا بہ گل بھی رہیں ـــ احترام، عزت اور چاہت کی فضا اُس وقت تک ہی برقرار رہے گی جب تک زبان سَتر پوش ہوگی اور لفظ "آپ" زبان کا ستر ہے۔

مختصر نظمیں

احسن علی خان

صبح کی کھوج میں

حالی کی شب گزیدہ و خم دار گلیوں میں
ہم ڈگمگا کر گرے
عمرِ رفتہ کو آواز دینے لگے
اور سُن کر اِس آواز کو
آنے والی سحر
آدھے رستے سے واپس ہوئی
عمرِ رفتہ کو مُردہ تھی جاگی نہیں
اور ہم
زندگی کی کندوں کو تھامے
اُٹھے
جھاڑ گردِ اُفتاد
پھر چل پڑے
صبح کی کھوج میں

وجودیت

اگر ہم جانور ہوتے
تو کچھ لمحے
جہاں اور جب بھی ملتے
پیار کر لیتے
اور اس کے بعد ہی
اک دوسرے کو
اور اپنے پیار کو بھی
بھول جاتے ہم
کہ حیوانوں کی دنیا میں
نہ یادیں ہیں نہ سوچیں ہیں
نہ ماضی ہے نہ مستقبل

بساط

ذرے ذرے میں رنگ رقص کرے
کیا تماشہ کسی کا عکس کرے
کتنے نغمے سنائی دیتے ہیں
میری آواز کے ابھرنے تک

زینہ

رات کا وقت چاندنی میں اسیر
دل کا انداز روشنی کی لکیر
چار سو دائرے ہیں خواہش کے
بڑھتے جاتے ہیں فاصلے دل کے

اکبر کاظمی

سڑک

ہر طرف روشنی کی قندیلیں
جگمگاتی ہوئی حسین صبحیں
لوٹ کر لے گئیں مرا ایماں
کیسا اندازِ دلربائی ہے

مسکراہٹ

میں دکھاتا ہوں آئینہ تجھ کو
تو مجھے زندگی کی مشعل دے
آ ذرا دونوں ساتھ ساتھ چلیں
آرزو کے دیئے نہیں جلتے

آس

میرے اندر ہے روشنی کیسی
کیا بتاؤں ہے زندگی کیسی
ہر طرف جاگتے ہوئے نغمے
میری تنہائی کا جواب نہیں

سید یٰسین قدرت

پڑاؤ کے منظر (نذر محمد اشرف)

تجھے خبر ہے پڑاؤ کے سارے منظروں کی

جہاں پہ تو نے گلاب کتنے اگائے تھے (گلبنوں کے کتنے ہی سلسلے تھے روش روش پر)

تجھے خبر ہے

مہکتے دن اور مچلتی راتوں کی

جو ترے سانس کی معطر، رسیلی، عودی، مہکتی خوشبو میں بس کے کندن بنے ہوئے تھے

شعاعِ مہتاب اور پچھلے پہر کی لَو بھی

کہ جو لباسِ ادا بدن پر سنوارتے کو، ترے ہی آئینہ خانے سے کسبِ فیض کرتی تھیں

تجھے خبر ہے

کہ شفق کی پری پڑاؤ کے آبِ زر کے سنہرے تالاب میں نہا کر، پروں میں سونے کے رنگ بھر کے جبینِ آفاق پہ سنورنے کو

طلائی جھومر سجائے رکھتی تھی — تجھے خبر ہے قیام کے باغ کی

جہاں چنبیلی سفید کلیوں کے گجرے

پڑاؤ کے پیکرِ کلس کی صراحی گردن میں ڈال کر ایک گوری، شفاف چاندنی سی بنی ہوئی تھی

تجھے خبر ہے — چلی جب آندھی (ہوا جو بدلی)

تو پھر پڑاؤ کے سارے خیمے اکھڑ گئے تھے

مسافرانِ قیام سارے اجڑ گئے تھے — (بکھر گئے تھے)

پڑاؤ کے قافلے کا سالار

کہیں خلاؤں میں کھو گیا تھا — مگر تجھے اس کے بعد کے حال کی بتا کچھ خبر ہوئی ہے

کہ آج سارے گلاب مرجھا گئے ہیں — گلبن اُجڑ گئے ہیں

شفق کی بے بس پری کے پنکھوں، پروں میں اب ہے کہاں بہارِ طلا، کہ اب تو وہ ہو چکی ہے خزاں کا اک نقشِ زرد

شعاعِ مہتاب اور پچھلے پہر کی لَو بھی پڑے ہیں ویراں، پریشاں صحراؤں، ہجر کے اک اندھیر بن میں

وہ گوری شفاف چاندنی ماند پڑ چکی ہے (تمام گجرے بھی اب فسردہ ہیں)

مگر اے سالار یاد رکھنا! پڑاؤ کے قافلے کے اک کم ملول راہی کے ذہن میں سارے منظروں کی اداس باسیں بسی ہوئی ہیں

خلاؤں میں کھو گئے پڑاؤ کے کارواں کے عظیم سالار کے بدن کی مہکتی خوشبو بسی ہوئی ہے رچی ہوئی ہے اس ایک راہی کے تن بدن میں — کہ آج اس قافلے کے سالارِ بدن کی اڑان کے عطر بیز لمحے اتر چکے ہیں، بسے ہوئے ہیں مشامِ جاں میں

اُٹھا کے، اپنے بھی شک کی حسن کی آنکھ کو،

دیکھ لے یہ منظر

فوزیہ بوکیلی (لبنانی شاعرہ)
ترجمہ: شاہین مفتی

اے لوگو!

اے لوگو
تم سب ایک جیسے ہو
اور ایک ہی طرح
دُنیا میں رہتے ہو
تم سب زمین کے باسی ہو
جو اس طویل و عریض کائنات کا ایک
حصہ ہے
پھر تمہاری حالت ایسی کیوں ہے؟
تم نفرت کرتے ہو اور ایک دوسرے کو
قتل کرتے ہو
رنگ و نسل کے باعث
عقیدے کے باعث
زمانہ بدل گیا
مگر
تم
ابھی تک
پُرانے تعصبات سے چمٹے ہوئے ہو

اے لوگو
تم سب ایک ہی طرح
دُنیا میں رہتے ہو
پھر تم سب یہاں
مل جل کر کیوں نہیں رہتے؟

ماہ طلعت زاہدی

سفر

میں ساحلوں پر ہوا کے جھونکوں میں
شادماں تھی
اور اپنی دُھن میں مگن بہت تھی
مجھے خبر کب تھی
مضطرب لہروں کے سفر میں
ہزار طوفانوں کے بھنور میں
اتھاہ گہرائیوں میں روشن نگر ہے ایسا
کہ رنگ جس کے دھنک سے اُجلے
چراغ جیسے کنول، گلاب اور موتیے کے
ازل کی شاہراہ پر چلے ہوں
ابد تلک نور میں ڈھلے نکہتوں کے بے انت
سلسلے ہوں
مجھے تو شوقِ نظارہ ساحل کی بھیگی ہواؤں
میں لے کر آ گیا تھا
انوکھی باتیں نہ ہونے والی جو تھیں
اچانک وہ ہو گئیں، پھر

نہ جانے ساگر کے جی میں کیا تھا
ہوا کے ہاتھوں پہ ایک گرداب رکھ
کے بھیجا

کھلیں جو آنکھیں ــــ میں بیچ گرداب میں تھی
چاروں طرف طلسمِ وصال سا تھا
ہزار ہا ہاتھ ایک ساگر کے مجھ کو تھامے
ہوئے تھے جیسے
زمیں سے جیسے شعاعیں سی پھوٹتی تھیں پیہم
کہ آسماں سے ستارے مجھ پر برس رہے تھے
میں روشنی کی طلب میں، خوشبو کی
چاہتوں میں
کنول، گلاب اور موتیے کی لگن میں
طوفان جھیلتی
لمحہ لمحہ آن دیکھی کائناتوں کو بڑھ رہی تھی

منظر اِک بلندی پر

تقی حسین خسرو

ہمارے مکان کے عقب میں پتلی سی گلی کے دوسری جانب موجود مکان کی نئی نئی چھت پڑی ہے۔ بیچاروں نے بہت دنوں تک سیمنٹ کی چادروں والی چھت کے نیچے گزارا کیا تھا۔ چنانچہ اب جب کہ وہ اس قابل ہو گئے تھے کہ اپنے مکان کی چھت بنا سکیں تو انہوں نے اپنی اِس استطاعت کا اظہار نہ صرف پکی چھت بنا کر کیا تھا بلکہ اپنی چھت کو آس پاس موجود مکانوں کی چھتوں سے اونچی بھی بنایا تھا۔ اُن کی اس حرکت پر سب ہی لوگوں کو تشویش تھی۔ لوگوں کی یہ تشویش اپنی جگہ معقول بھی تھی کہ وہ سب سے پہلے تو اس بات پر فکر مند تھے کہ ان مکان والوں کے پاس اچانک ہی یہ پیسہ کہاں سے آگیا تھا؟ آخر پکی چھت کے بنانے میں سیمنٹ، بجری اور لوہا خرچ ہوتا ہے اور یہ چیزیں کتنی کمیاب اور مہنگی ہیں! اور پھر مزدوری ۔۔۔ اُس کے تو خیال ہی سے چکر سا آجاتا ہے۔ پھر یہ سب کچھ کیسے ان مکان والوں کے لئے ممکن ہو گیا تھا؟ اِس کی کوئی معقول وجہ لوگوں کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ کیونکہ ابھی ان مکان والوں کا کوئی بچہ بھی تو اس قابل نہیں ہوا تھا کہ وہ مشرقِ وسطیٰ کے کسی ملک کا رُخ کرتا اور پھر وہاں سے اپنے گھر والوں پر روپے پیسے کی بارش کر دیتا۔ وہ لوگ اُس مکان والے کی آمدنی اور ذرائع آمدنی سے بھی خوب واقف تھے۔ پھر یہ سب کچھ کیسے ممکن ہو گیا تھا؟ یہی سوال بار بار اُن کے ذہنوں میں گونج اُٹھتا۔ مگر اُس مکان والے نے لوگوں کی اس تشویش اور فکر کی کوئی پرواہ نہیں کی تھی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے اپنے مکان کی چھت نہ صرف پکی بنا دی تھی بلکہ دوسری چھتوں سے اونچی بھی۔

میری بیوی نے بھی مجھ سے کئی دفعہ مکان کے پچھواڑے اس تیزی سے اونچی ہوتی چھت کا ذکر کیا تھا۔ مگر میری بیوی کی فکر کا زاویہ لوگوں سے بالکل مختلف تھا۔ اُسے اِس کی بالکل فکر نہیں تھی کہ ان مکان والوں کے پاس پکی چھت بنانے کے لئے پیسہ کہاں سے آگیا تھا؟ اُسے جو فکر تھی وہ یہ تھی کہ یہ تیزی سے اونچی ہوتی چھت جب بن چکے گی تو ہوا کا راستہ روکے گی اور اس کے حائل ہونے کی وجہ سے ہمارے مکان کے عقب میں کچھ ہی فاصلے پر واقع مسجد کے خوبصورت مخروطی مینار نظر نہیں آئیں گے۔ "کیا پتہ ان کا ارادہ دوسری منزل تعمیر کرنے کا ہو اور اگر ایسا ہوا تو پھر ہم مستقل طور پر حبس کا شکار ہو جائیں گے۔ اُف میرا تو اُن دنوں کے خیال ہی سے دم گھٹنے لگتا ہے۔" میری بیوی کی فکر کا یہ زاویہ بہت زیادہ ذاتی ہونے کے باوجود اس اعتبار سے یقیناً صحیح تھا کہ کراچی میں ہوا کا راستہ کچھ اس قدر زیادہ واضح اور کچھ اس قدر زیادہ یک رُخی ہے کہ اِس معاملے میں دُنیا کے مہذب ترین شہروں کی ٹریفک بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ ہوا جس کی آوارگی پسندیدہ اور جس کی بے قاعدگی ناپسندیدہ نہیں ہوتی کراچی میں وہ واحد شئے ہے جو اپنے مزاج میں بے انتہا منظم اور چال میں بے انتہا باقاعدہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس شہر کا ہر مکیں اپنے مکان کا رخ مغرب کی سمت چاہتا ہے مگر بدقسمتی سے ہمارے مکان کا رُخ مغرب کی جانب نہیں مشرق کی جانب ہے۔ مگر ہم لوگ اس معاملے میں یقیناً خوش قسمت تھے کہ ہمارے پچھواڑے پتلی سی گلی کے دوسری طرف موجود مکان کی چھت نیچی تھی۔ اِس طرح مغرب سے چلنے والی ہوا کے دل لُبھانے والے جھونکے اپنے راستے میں رُکے بغیر سیدھے ہمارے مکان کے چھوٹے سے صحن میں در آتے اور پھر دبے پاؤں کمروں میں پہنچ کر دروازوں اور کھڑکیوں کے پردوں سے اٹھکھیلیاں کرتے اور دیواروں اور چھتوں سے ٹکرا کر ایک عجیب گونج سی پیدا کرتے! ایسے میں ہمارے مکان کی سیمنٹ

اور گارے سے بنی بھاری دیواریں اور وزنی چھتیں ہلکی پھلکی اور لطیف ہو کر ہوا کے دلفریب لمس سے بلند ہوتے ہمارے احساس ہی کی طرح آسمان کی بلندیوں کو چھونے لگتیں۔ مگر کبھی ایسا بھی ہوتا کہ ہوا کے یہی جھونکے بغاوت پر اُتر آتے۔ ایسے میں دروازے اور کھڑکیاں اپنے چوکھٹوں سے بے زار نظر آتیں۔ گھر کی قرینے سے رکھی اشیاء بے قرینہ ہو جائیں اور کبھی کوئی برتن زور سے چیخ کر شہید ہو جاتا۔ مگر ہوا کے جھونکوں کی یہ بغاوت اپنی تمام شدت۔ اور تخریب کاری کے باوجود بچوں کی شرارت ہی کی طرح معصوم، فطری اور منصوبہ بندی کے تعلق سے بالکل ہی بیگانہ ہوتی۔ اور اسی لئے اُسی طرح دلآویز بھی! چنانچہ میری بیوی اس پر جھنجھلانے کے باوجود خفا نہیں ہوتی۔ اُس کی یہ جھنجھلاہٹ بچوں کی شرارت سے پیدا ہونے والی جھنجھلاہٹ ہی سے مُشابہہ ہوتی۔ مگر ہوا کے یہ باغی جھونکے بھی بچوں ہی کی طرح میری بیوی کی تمام جھنجھلاہٹ کے باوجود اپنی شرارتوں سے باز نہ آتے۔ چنانچہ ہوا کے ان باغی جھونکوں کی شرارت اور میری بیوی کی جھنجھلاہٹ جاری رہتی۔ شرارت، میں نے اپنی بیوی کے لئے اپنے دل کی گہرائیوں میں ایک عجیب درد محسوس کیا! ممتا کی ماری میری بیوی برسوں سے اُس دن کی منتظر تھی جب ہمارے مکان کے چھوٹے سے صحن میں کوئی اپنے چھوٹے چھوٹے قدموں سے چلتا، گلکاریاں بھرتا اُس کی جانب دوڑ کر آئے اور وہ بڑھ کر اُس کے چھوٹے سے حیات افروز وجود کو اپنی بانہوں بھرے سینے سے لگائے اور اپنے سینے میں دھڑکتی باقی ماندہ زندگی بھی اُس کے ننھے سے جسم میں منتقل کر دے اور اس طرح خود اپنی زندگی کی تکمیل کر لے۔ اور کبھی — یہی ننھا سا وجود شرارت پر اُتر آئے، سارے گھر میں دوڑتا پھرے زور زور سے روئے اور کبھی کوئی قیمتی برتن بلاوجہ پٹخ کر توڑ دے۔ وہ اِسے سمجھائے، سینے سے لگائے اُس کا معصوم سا منہ چومے مگر وہ منائے نہ منے اور اپنی شرارت سے باز نہ آئے — میری بیوی بانجھ نہیں تھی۔ کاش وہ بانجھ ہی ہوتی تو اِس مسلسل تڑپ اور اِس کبھی نہ ختم ہونے والی آرزو سے نجات پا جاتی۔ بچے کی آرزو مجھے بھی تھی۔ مگر ایسی نہ تھی کہ پھر اُس کے بعد کسی اور آرزو کا تصور ہی باقی نہ رہے۔ یا شائد یوں تھا کہ میں اسے کوئی ناقابلِ حصول بات نہیں سمجھتا تھا۔ میں باپ بن چکا تھا اور میری بیوی ماں! مگر پھر ہم سے ہمارا یہ اعزاز بہت جلد چھین لیا گیا تھا۔ اِس حادثے کو پورے چھ سال ہو گئے تھے۔ میں اُس حادثے کو بھول بھی گیا تھا۔ میری بیوی بھی اُس حادثے کو بھول گئی تھی۔ وقت تیزی سے گزرتا ہے اور نہ صرف گزرتا ہے بلکہ گزر کر اپنے پیچھے واقعات اور حادثات پر گرد و غبار کی تہیں بھی چھوڑتا جاتا ہے۔ شائد یہی وجہ ہے کہ ہم لوگ یاد کم رکھتے ہیں اور بھولتے زیادہ ہیں — مگر نہیں — اب مجھے محسوس ہوا کہ یہ میری بھول تھی۔ میں اپنی ہی طرح اپنی بیوی کو بھی نسیاں کا مریض سمجھتا تھا۔ ہمارے مکان کے چھوٹے سے صحن میں در آتے ہوا کے جھونکوں کے بارے میں میری بیوی کا رویہ میرے سامنے تھا۔ میں نے اِس سے پہلے اُس کے اِس رویے کے بارے میں شائد ہی غور کیا تھا۔ ہوا کا ہلکا پھلکا مگر شریر جھونکا بچے سے کس قدر مشابہ ہوتا ہے۔ شائد یہی وجہ تھی کہ میری بیوی ہوا کے جھونکوں کی شرارت پر جھنجھلاتی تو تھی مگر ناراض نہیں ہوتی تھی۔ اِس شرارت سے جھنجھلاہٹ تک کے سفر میں اُس کے لئے ایک عجیب تسکین کا سامان موجود تھا! اور اب جب کہ پتلی سی گلی کے دوسری جانب موجود مکان کی چھت تیزی سے اُونچی ہوتی جا رہی تھی تو مجھے لگا میری بیوی کی زندگی میں پھر حادثہ ہونے والا تھا۔ بالکل ویسا ہی حادثہ جیسا آج سے چھ برس پہلے ہوا تھا۔ پھر میری بیوی ایک نیک دل اور خداترس خاتون تھی۔ مسجد کے مخروطی میناروں کا نظارہ نہ صرف اُس کے لئے اُس کے خداترسی کے جذبے کی مسلسل تسکین کا باعث تھا بلکہ سمت کے تعین کا باعث بھی۔ وہ روز و شب کے چوبیس گھنٹوں میں جب کبھی خدا کو یاد کرتی تو اُس کی نظریں از خود اُن خوبصورت مخروطی میناروں کی جانب اُٹھ جاتیں جو دن میں نیلے آسمان کے پس منظر میں زیادہ بلند، زیادہ قریب اور زیادہ پُرشکوہ نظر آتے۔ اور رات اُن میں جلتی سبز روشنی آنکھوں کی راہ سے دل میں اُتر کر دیر تک اُجالا کرتی۔ چنانچہ اب میں خود بھی اِس تیزی سے اُونچی ہوتی چھت کے بارے میں فکرمند ہو گیا تھا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ اس کی تعمیر کسی طرح رکوا دوں۔ اِس کی وجہ شاید میرا اپنا مزاج بھی تھا کہ میں تعمیر کے کسی بھی کام کو بہت زیادہ تحسین کی نظر سے نہیں دیکھتا۔ عمارتی تعمیر کے کام کو تعمیراتی کام میں زیادہ دلچسپی مجھے کارِ لاحاصل معلوم ہوتی تھی۔ میں اُن لوگوں کو ہمیشہ ہی حیرت اور استعجاب سے دیکھتا تھا جو بڑے چاؤ سے مکان بناتے ہیں۔ اندر اور باہر کی دیواروں کے لئے الگ

الگ رنگ منتخب کرتے ہیں۔ دروازے، کھڑکیاں اور چوکھٹیں قیمتی لکڑی یا المونیم کی بنواتے ہیں، بجلی کے بلب کے شیڈز، پردوں کے فریم، سورج کو کرچی کرچی کرنے والی چلمنیں، ایرکنڈیشنرز کا اہتمام اور پتہ نہیں کیا کیا کرتے ہیں۔ مجھے یہ سب لوگ بے وقوف لگتے تھے۔ میرا خیال تھا کہ ہر تعمیر تخریب کو دعوت دیتی ہے اور ہر آبادی ویرانے کو انگیخت کرتی ہے۔ چنانچہ مجھے وہ شخص بھی بیوقوف ہی لگا تھا جو ہمارے مکان کے عقب میں پتلی سی گلی کے دوسری طرف اپنے مکان کی چھت بڑی توجہ اور انہاک سے پکی اور اونچی بنا رہا تھا۔ میں نے اُس شخص کو اُس کی اس حرکت سے باز رکھنے کے مختلف طریقے سوچے تھے۔ حد یہ کہ میں نے قانونی چارہ جوئی تک کا سوچا تھا مگر میری یہ سوچ اپنی تمام شدت کے باوجود سوچنے ہی تک محدود رہی تھی۔ میں سوچتا رہا تھا اور میری بیوی فکر کرتی رہی تھی مگر اُس شخص نے میری سوچ اور میری بیوی کی فکر کی کوئی پرواہ نہیں کی تھی اور ہماری نظروں کے سامنے اپنے مکان کی چھت نہ صرف پکی بنا دی تھی بلکہ اور چھتوں سے اونچی بھی۔ ہمارے لئے وہ دن انتہائی غیر یقینی کیفیت کے حامل تھے جب وہ شخص اپنے مکان کی چھت پکّی بنا چکا تھا اور اب یہ اندیشہ تھا کہ وہ دوسری منزل کی تعمیر بھی شروع کر دے گا۔ کیونکہ اُس کے لئے اپنا خرچ کیا ہوا روپیہ نکالنے کا بس یہی ایک طریقہ ہو سکتا تھا کہ وہ دوسری منزل تعمیر کر کے کرائے پر اٹھا دے اور کرائے دار سے لمبا ایڈوانس وصول کرے۔ مگر اُس دن ہم لوگ حیران رہ گئے تھے جب ہم نے حتمی طور پر محسوس کیا کہ ہمارے مکان کے عقب میں پتلی سی گلی کے دوسری جانب جاری تعمیری کام بند ہو گیا تھا۔ وہ شخص اپنے مکان کی چھت محض پکّی بنا کر مطمئن ہو گیا تھا۔ مجھے وہ آدمی نہیں معلوم کیوں شریف اور خدا ترس لگا تھا۔ مگر بہر حال اُس کے مکان کی پکّی اور اونچی چھت مغرب سے چلنے والی ہوا کے راستے میں حائل ہو گئی تھی۔ اور میری بیوی نہ صرف مغرب سے چلنے والی ہوا کے اُن باغی جھونکوں کی شرارت سے محروم ہو گئی تھی جو راستے میں رُکے بغیر ہمارے مکان کے چھوٹے سے صحن میں در آتے اور پھر دبے پاؤں کمروں میں پہنچ کر دروازوں اور کھڑکیوں کے پردوں سے اٹکھیلیاں کرتے اور پھر دروازوں اور چھتوں سے ٹکرا کر ایک عجیب گونج سی پیدا کرتے بلکہ مسجد کے اُن خوبصورت مخروطی میناروں کے نظارے سے بھی جن کا نظارہ اُس کے لئے اُس کے خدا ترسی کے جذبے کی تسکین کا باعث تھا۔ مگر میری بیوی خاموش تھی۔ میری بیوی کو کسی بھی بات کا اندیشہ یقیناً بے چین اور بے قرار کر دیتا تھا۔ مگر جب اندیشہ بالآخر حادثے میں تبدیل ہو ہی جاتا تو وہ خاموش ہو جاتی۔ وہ سنگین سے سنگین حادثے پر بھی اپنے ردِ عمل کا اظہار محض خاموشی اختیار کر کے ہی کرتی تھی میں اُس کی اس عادت پر شدید اُلجھن محسوس کرتا تھا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ وہ بھی اور عورتوں کی طرح اپنے ردِ عمل کے اظہار میں چیخے، چلّائے اور روئے اور پھر نارمل بھی ہو جائے۔ مگر وہ محض خاموش ہو جاتی اور پھر یہ خاموشی اُس پر دنوں مسلط رہتی۔ اُس کی اس خاموشی میں گھر کے در و دیوار بھی اُس کے شریک بن جاتے اور لگتا خاموشی گھر کی دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کر گونج رہی ہو۔ ایسے میں میں ایک شدید اُلجھن محسوس کرتا۔ مگر اس دفعہ میری بیوی کی خاموشی مجھے بہت زیادہ بار نہیں گزر رہی تھی۔ اس کی وجہ شائد یہ تھی کہ میں خود بھی خاموش تھا۔ اور گھر کے در و دیوار کی طرح اپنی بیوی کی خاموشی میں اُس کا شریک! ہم دونوں اپنے اپنے چائے کے پیالے اُٹھائے اپنے مکان کے چھوٹے سے دالان میں خاموش بیٹھے تھے۔ ہمارے سامنے چھوٹا سا صحن تھا۔ اور پھر عقبی دیوار کے اُس طرف پتلی سی گلی تھی اور گلی کے اُس طرف وہ مکان جس کی چھت حال ہی میں پکّی اور اونچی بنا دی گئی تھی۔ ظاہر ہے ہمارے سامنے اُس مکان کا عقبی حصّہ تھا۔ جس کی دیوار بے قلعی تھی اور اُس میں سے جگہ جگہ سے لوہے کے زنگ زدہ ٹکڑے جھانک رہے تھے۔ ہم دونوں کی نظریں اُس بے قلعی دیوار کی ناہموار، کھُردری سطح پر رینگ رہی تھیں۔ کھُردری ناہموار سطح چاہے قدموں کے نیچے ہو یا نظروں کی راحت کا باعث نہیں ہوتی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ میری نظریں بہت جلد دیوار کی سطح سے بلند ہو گئی تھیں۔ اب میری نظروں کے سامنے و [illegible] دے ستون تھے جو شائد آئندہ بنائی جانے والی اوپر کی منزل کے لئے ادھورے ہی چھوڑ دیئے گئے تھے۔ اُن ستونوں میں سے جھانکتے لوہے کے سریئے آسمان کی جانب مسلسل منہ چڑانے محسوس ہو رہے تھے۔ اب جب میری نظریں مزید بلند ہوئیں تو ——— میں جیسے دفعتاً کسی قید سے آزاد ہو گیا تھا۔ میں نے اپنے مکان کے چھوٹے سے دالان میں سے اتنی بلندی پر شائد ہی کبھی دیکھا تھا۔ نیلے آسمان کی بیکراں وسعتیں میرے سامنے تھیں! اور وہ سفید بُراق کبوتروں کا جوڑا جو آسمان کی پہنائیوں میں اُترتا جا رہا تھا۔ میری بیوی نے بھی شائد

(بقیہ صفحہ ۴ پر)

کونپل اور کرنیں

ڈاکٹر حسرت کاسگنجوی

مارننگ واک سے واپسی پر چوراہے پر پہنچتے پہنچتے ریٹائرڈ بوڑھوں کا یہ گروہ جو مختلف موضوعات پر گفتگو کرتا چلا آ رہا تھا اپنی اپنی گلیوں میں مڑ گیا تھا شیخ صاحب کو بھی چوراہا پار کر کے ایک سمت میں جانا تھا لیکن نہ جانے کیوں چلتے چلتے ان کے پاؤں رک گئے ۔ ایسا لگا جیسے وہ کچھ بھول گئے ہوں ۔ اُن کے چہرے پر عجیب سی اُداسی تھی آہستہ آہستہ ان کی آنکھیں بند ہو گئیں جیسے کسی گہرے خیال میں غرق ہو گئے تھے ۔ نہ جانے کہاں سے ان کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے ۔ بدن ڈھیلا پڑ گیا یہ کیا زندگی ہے ۔ بے بسی بے کسی ، مجبور و مقہور بے مصرف زندگی ۔ آخر وہ کس لئے زندہ ہیں ۔ کسے ان کی ضرورت ہے ۔ وہ اب کس کے لئے زندہ رہیں ۔ وہ اب تک کیوں زندہ ہیں ۔ وہ کیوں سانس لے رہے ہیں ۔ جب ان کی کسی کو بھی ضرورت نہیں ہے ۔ جب ان کے بغیر سارے کام اور بھی بہتر انداز سے چل سکتے ہیں تو پھر وہ ایک بوجھ ہی ہیں نا ۔ اس بوجھ کو زمین سمیٹ کیوں نہیں لیتی ، یہ سانس رک کیوں نہیں جاتی ۔ میں ...... شیخ صاحب کی آنکھوں سے پہلے تو ٹپ ٹپ آنسو گرے پھر جھڑی سی لگ گئی ہچکیاں بندھ گئیں ۔ ان کا سفید ململ کا کرتا بھیگنے لگا ۔ ان کی آنکھوں کے سامنے گہری دھند سی چھا گئی چوراہے کے راستے دھندلا گئے پھیل گئے ، عجیب عجیب ، ٹیڑھے میڑھے آڑے ترچھے ، وحشت ناک اور ویران بند دکانیں ، خاموشی ، انجانے سے خوف ۔ یہ ساری باتیں شیخ صاحب نے جیسے ایک ساتھ محسوس کیا ۔

یا الٰہی یہ کیا ہو رہا ہے آج پھر شیخ صاحب کا ذہن خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا ۔ خیالات نے انہیں گھیر لیا تھا ۔ الٰہی میرے تو خاندان کا شیرازہ ہی بکھر جا رہا ہے ۔ میری برسوں کی ریاضت ، تربیت ، اصول ، رکھ رکھاؤ ، وضعداری ، رعب ، دبدبہ ، وقار ، زندگی کا مخصوص پیٹرن یہ سب کے سب آنے والے سیلاب اور طوفان کی شدت اور بہاؤ کے رخ پر ایک حقیر تنکے کی حیثیت میں اپنی ساری حقیقتیں کھو رہے ہیں میرے اخلاقیات کے فلسفے ، میرے رکھ رکھاؤ ، میرا زندگی بھر کا بھرم یہ سب کے سب میری آنکھوں کے سامنے ہی تباہ ہو رہے ہیں ۔ میں محض تماشائی کی حیثیت سے زندہ ہوں ۔ میرے منہ پر مسلسل طمانچے پڑ رہے ہیں ۔ میری انا کو مسلسل مجروح ہی نہیں کیا جا رہا ، ذبح کیا جا رہا ہے اور مجھ پر یہ پابندی بھی ہے کہ میں یہ سب کچھ زندہ رہ کر دیکھوں ۔

میں زندگی کے کسی بھی کربناک پہلو پر ہمت نہیں ہارا ۔ میں نے غربت کے دن بھی دیکھے ، میں نے کئی کئی دن کے فاقے بھی کئے ۔ مجھے وہ وقت بھی یاد ہے جب میں پاکستان آیا تھا تو ایک پھٹا سا تمبو مجھے رہنے کے لئے ملا تھا جس میں بارش سے ہم سب بھیگ جاتے تھے ۔ دونوں بچے سردی کی بارشوں میں مجھ سے چپٹ جاتے اور میں انہیں محفوظ رکھنے کے لئے ہر ممکن کوشش کرتا ۔ میں نے فاقے کئے اس وقت بھی میں اپنی جگہ پر مطمئن تھا میرے ذہن میں شعلے اس طرح کبھی نہیں لپکے ۔ وقتی طور پر تکلیفیں برداشت کرنے کا میں عادی سا ہو گیا تھا ۔ وقت کے ساتھ ساتھ میں ان تکلیفوں کو بھول جاتا تھا نوکری ملنے کے کافی دن بعد بھی کسی نہ کسی پریشانی میں مبتلا رہا لیکن کبھی بھی یہ باتیں میرے ذہن پر بھوت بن کر سوار نہیں ہوئیں میں نے مردانہ وار مقابلہ کیا اور میں نے فتح بھی حاصل کی میں نے اپنی مسلسل جد و جہد اور خدا پر بھروسے کی بدولت حالات کا رُخ موڑ ڈالا میں نے محنت کی دن رات کسی نہ کسی کام میں مصروف رہا ۔ میں نے اپنے بچوں کی تعلیم پر سب کچھ خرچ کر ڈالا ۔ میں نے ہمیشہ اس بات کا خیال رکھا کہ بچوں کو غربت کا احساس

نہ ہونے پائے اور پھر میں ایسا غریب بھی نہیں تھا دونوں
وقت کھانا تھا۔ پہننے اور رہنے کو بھی اللہ نے
دیا تھا۔ میں نے پیسہ پیسہ کرکے جمع کیا۔ ضرورتوں
کے لئے قرض بھی لیا۔ تنگی ترشی بھی برداشت کی لیکن
یہ طویل دور بس گذر ہی گیا۔ اب اسے یاد کرتے
سے حاصل بھی کیا۔ کوئی کام رکا تو نہیں سارے کام
چلتے ہی رہے ساری ضرورتیں کسی نہ کسی طرح پوری
ہوتی رہیں۔

ہاں مجھے یاد ہے اس وقت کچھ پریشانیاں بڑھ
گئی تھیں، جب شاہد کو میڈیکل میں داخل کرایا تھا۔
ایک کتاب تو پانچ سو روپے سے بھی زیادہ کی آئی
تھی۔ جب قرض نہیں ملا تھا تو میں کتنا گھبرا گیا تھا۔
میں نے اپنی کئی بہت ضروری چیزیں بیچ دی تھیں
اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہونے دی تھی۔ میں نے
کبھی بھی شاہد کو احساس کمتری کا احساس نہیں ہونے
دیا۔ خالد کو انجینئرنگ میں داخلہ دلوایا۔ ماجد
کے لئے تو اور بھی زیادہ پاپڑ بیلنے پڑے۔ اس
کے اخراجات، نفاست پسندی، اور سی ایس
ایس کے امتحان کی تیاری کے سلسلے کے اخراجات
وہ امتیازی حیثیت سے کامیاب بھی ہوا۔ نازو بی بی
نے ہوم اکنامکس میں ایم ایس سی کی اور وہ کالج میں
استاد مقرر ہو گئی۔ آج یہ جو ڈاکٹر، انجینئر، ڈپٹی کمشنر
اور پروفیسر ہیں ان کے لئے ساری زندگی میں نے
کیا کیا کیا میں ہی جانتا ہوں۔ میں نے اپنے اصولوں اور
تمناؤں کے لئے جو سعی مسلسل کی اس کا اندازہ مجھے
ہی ہے۔ حد تو یہ ہے کہ ان تمام تکلیفوں اور صعوبتوں
کو تنہا برداشت کیا اپنی بیوی تک کو اس میں شامل نہیں
کیا۔ میں کبھی بھی حرف شکایت زبان پر نہیں لایا کہ دن
رات کی شدید محنت اور ہر وقت فکروں میں مبتلا
رہنے سے میری صحت پر کیا اثر پڑا ہے۔ میں نے یہ
ساری مصیبتیں اس لئے بھی برداشت کرلیں کہ یہ میرا
فرض تھا۔ مجھے یہ سب کچھ کرنا ہی چاہیئے تھا۔ گھر کے
سب لوگ میری بات بھی مانتے تھے اور میرے اصولوں
کو بھی اہم سمجھتے تھے۔

(۲)

سلمٰی تم کو بھی اب میری ضرورت نہیں رہی۔ ہمارا
چالیس سال کا طویل ساتھ ہے چالیس سال بڑا وقت ہوتا
ہے۔ دو نسلیں جوان ہو جاتی ہیں میں نے ہر ممکن طریقے
پر تمہارے ساتھ نباہ کرنے کی کوشش کی لیکن جب
تمہیں غصہ آتا تھا تم پھٹ پڑتیں اور میں نے نہایت
صبر اور شکر کے ساتھ سب کچھ سنتا تھا میرے دل
و دماغ پر کیا بیتتی تھی میں اس اذیت ناک عذاب
کے بارے میں کسی کو کچھ بتا بھی نہیں سکتا۔ میرے پاس
الفاظ ہی نہیں۔ وہ وقت عذاب کا لامتناہی سلسلہ
ہوتا تھا۔ تم مجھے میری غربت کے طعنے دیتی تھیں، میرے
ماں باپ کو کوستی تھیں۔ تمہیں اس بات کا قلق تھا کہ
بڑے لوگوں کی طرح میں تمہارے لئے عیش و عشرت
مہیا نہ کرسکتا تھا۔ میری زبوں حالی کا اس سے بڑا ثبوت
اور کیا ہو سکتا ہے کہ ان طویل چالیس سال میں میں تمہیں
ایک لمحہ کے لئے بھی اپنا حال نہ سنا سکا۔ میں نے تمہارا
موڈ دیکھ کر ہمیشہ بات کی مجھے معلوم تھا کہ اگر میں نے
تمہارے خوشگوار موڈ کو دیکھ کر بات نہ کی تو تم شعلے کی
طرح بھڑک جاؤ گی۔ تنہائیوں میں جب میرے غم
ڈھیرے ڈھیرے جاگتے ہیں اور کسی ساتھی کی ضرورت ہے؟
شدت کے ساتھ محسوس ہوتی ہے تو خود کو تنہا محسوس کرتا
ہوں اس جہنم کو برداشت کرتا ہوں۔ میں نے محض تمہاری
جلی کٹی باتوں اور طعنوں سے بچنے کے لئے محض تمہاری
خوشیوں کے لئے، محض اپنے اصولوں کی برتری کے
لئے اور تمہارے جارحانہ رویئے سے زندگی میں مزید تلخی
پیدا ہو جانے کے خوف سے تمہیں اپنے غموں میں شریک
کرنے کا خیال بھی ذہن میں نہیں آنے دیا۔ سلمٰی! کبھی
کبھی سوچتا ہوں کہ تمہارا دل کتنا سخت، کٹھور اور
بے حس ہے کیا یہ ممکن ہے کہ تم نے بارہا میرے چہرے
پر ہوائیاں اڑتی ہوئی نہ دیکھی ہوں گی۔ کیا ان طویل
چالیس سالوں میں تم نے مجھے غمگین، اداس، افسردہ اور
مضمحل نہیں دیکھا ہوگا؟ میری آنکھوں میں بے بسی اور
مجبوری کے آنسوؤں کو تیرتے ہوئے نہیں دیکھا ہوگا؟
سلمٰی ان چالیس سالوں میں یقیناً بہت سے ایسے موقعے
آئے ہوں گے جب میں باوجود احتیاط کے اپنے اوپر قابو
نہ رکھ سکا ہوں گا۔ کیا کبھی تم نے میرے چہرے کو پڑھا،
میرے زخمی دل کو ٹٹولا میں بھی انسان ہوں، میرے بھی
جذبات ہیں، میں بھی محسوس کرسکتا ہوں۔ تمہاری مسلسل
بے حسی، بے تعلقی اور کھردرے رویئے پر بھی میں نے
اپنے دل میں مسلسل جلن محسوس کی ہے۔ تاریکیوں میں
میں پھوٹ پھوٹ کر رویا بھی ہوں میری ہچکیاں بھی بندھی
ہیں۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ میرا دل کٹ کٹ کر گر رہا
ہے میرے ذہن نے مسلسل ضربیں محسوس کی ہیں ___
مسلسل رونے سے میرا جی ہلکا بھی ہوا ہے ___ چالیس
سال، سلمٰی چالیس میں نے یہ عذاب بھگتا ہے۔

سلمٰی تمہارا بڑا بیٹا ڈاکٹر ہو گیا لیکن اس طرح کے
ڈاکٹر تو بہت تھے ہاؤس جاب کے بعد سترہ گریڈ کی لے

بھی نوکری مل گئی تھی لیکن وہ تو بہت اونچے خواب دیکھتا تھا وہ لندن سے اسپیلائزیشن کرنا چاہتا تھا اس کے لئے ایک بڑی رقم درکار تھی ـــ مجھے بھی اُس کی اس خواہش کا احساس تھا۔ ایک دفعہ پھر میں نے خود کو داؤ پر لگا دیا اور شاہد کی یہ تمنا بھی پوری ہوگئی میں اپنی ذمہ داریوں کے بوجھ تلے اور بھی بوڑھا ہوتا چلا گیا۔ تم نے، شاہد نے کسی نے بھی نہیں پوچھا کہ یہ سب کچھ کس طرح ہوا جب تم نے نہیں پوچھا تو میں تمہیں کیا بتاتا۔

شاہد کی پریکٹس بہت اچھی چلی دولت کی ریل پیل ہوگئی پرانی چیزیں سب کو بری لگنے لگیں۔ گھر میں کار آئی، ٹیلیفون لگے ـ رنگین ٹیلیویژن آیا، مکان کو از سر نو بنوایا گیا۔ اور یہ سب کچھ میری مرضی کے خلاف ہوا۔ مجھ سے کسی نے بھی مشورہ نہیں لیا۔ میں یہ سب کچھ اجنبی کی طرح دیکھتا رہا۔ کسی کو اتنی فرصت نہیں ملی کہ وہ مجھ سے پوچھتا کہ تم نے گھر کی ضرورتوں کے تحت جو قرضہ لیا ہے وہ تمہیں واپس بھی کرنا ہے پہلے وہ واپس کرو۔ تسلی جب تم نے تمہارے بیٹوں نے کبھی اس موضوع پر نہیں سوچا تو میری بھی غیرت نے گوارہ نہیں کیا کہ میں اپنا دکھڑا تمہارے سامنے روتا۔ میں نے سارے قرض خود ہی ادا کیے۔ تمہارا دوسرا بیٹا انجینئر بن گیا تھا تیسرا ڈپٹی کمشنر اور بیٹی پروفیسر اور میں ـــ میں محنت اور اصولوں کی آگ میں جل رہا ہوں۔

شاہد کی شادی کا مسئلہ تھا میں نے اس کے چچا کی لڑکی سے بہت پہلے خاندان کو یکجا رکھنے کے لئے نسبت طے کر دی تھی لیکن اس بات کو جیسے سارا گھر ہی بھول گیا شاہد نے خود ہی لڑکی کا انتخاب کیا اور جب شادی کی تاریخ قریب آئی تو مجھے دعوت نامہ ملا کہ آپ کی شرکت سے ہمیں خوشی ہوگی۔ یہ سانحہ بھی سہا۔ بھائی اور برادری نے مجھے ہی معتوب قرار دیا۔ مجھ پر کیا گزری کسی کو کیا معلوم۔ آنے والی بہو کے رنگ ڈھنگ بالکل نرالے تھے وہ جتنی زیادہ خوبصورت تھی اتنی ہی بد مزاج اور مغرور لیکن شاہد کی پسند تھی۔ اس لئے سارا گھر اس کے پیچھے پیچھے چلنے، اس کے اشاروں اور مزاج کو سمجھنے اور خدمت کرنے میں مصروف رہتا تھا۔ بہو نے شاید ایک دفعہ پوچھا بھی تھا کہ یہ کون حضرت ہیں اس جملے پر سارے گھر والوں پر ایک لمحہ کے لئے تو سکتہ سا طاری ہوگیا پھر شاید شاہد نے ہی دل پہ جبر کر کے بتایا تھا کہ یہ میرے والد ہیں ریٹائرڈ لائف گزار رہے ہیں۔

(۳)

بے معرف زندگی، ہاں بے معرف۔ گھر والوں کی نظر میں میری زندگی قطعی بے معرف ہے۔ جب یہ معرف کی تھی اس وقت بھی یہ ایک مختصر تنخواہ والی نوکری کی زندگی تھی اور اب جو پینشن مقرر ہوئی ہے اس سے زیادہ تنخواہ شاہد اپنے خانساماں کو دیتا ہے۔ اس لئے اس پینشن کا کبھی ذکر ہی نہیں آیا کسی نے کبھی پوچھا بھی نہیں۔

اپنے ہی گھر میں، اپنے ہی بچوں کے درمیان اجنبی۔ شیخ جی نے بے حد تنہائی محسوس کی۔ لے دے کر ایک گڈو تھا ان کا پوتا جو شیخ جی سے لپٹ جاتا۔ ان سے کہانیاں سنتا۔ انہیں اپنا سبق سناتا، ان کے ساتھ کھیل کھیلتا۔ جب گڈو ان کے پاس ہوتا وہ سمجھتے کہ ان کی زندگی بے معرف نہیں ہے۔ کوئی ایسا ہے جو ان سے دلچسپی لیتا ہے۔ وہ گڈو کو اپنی جوانی کے حال دلچسپی کے ساتھ سناتے۔ اپنی جدوجہد گڈو کو سمجھاتے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ایسا کر کے وہ گڈو کو ایک مستقل مزاج انسان بنا رہے تھے۔ اس میں انسانیت کا جذبہ پیدا کر رہے تھے اس میں تعلیم کی لگن پیدا کر رہے تھے۔ گڈو ان کی باتوں کو حیران اور دلچسپی کے ساتھ سنتا جیسے وہ یہ ساری باتیں پہلی بار سن رہا ہے۔ یہ باتیں اسے گھر میں کسی نے نہیں بتائی تھیں اور نہ کوئی اس قسم کی باتوں کو اہمیت دیتا۔

گڈو کا خیال ذہن میں آتے ہی شیخ صاحب کے اداس، غمزدہ اور سلوٹوں والے چہرے پر ایک ہلکی سی کرن نمودار ہوئی۔ ان کے چہرے کی تنی ہوئی رگیں ڈھیلی پڑ گئیں پھر انہوں نے ایک لمبی سانس لی یہ شیخ صاحب کے لئے اس بات کا اشارہ تھا جیسے وہ آلام دہر اور زندگی کی تمام بکھری ہوئی تلخیوں کو ایک گھونٹ میں پی گئے ہیں۔ ان میں زندہ رہنے اور زندگی کے بوجھ کو سہارنے کی ایک نئی قوت پیدا ہوگئی ہے۔ انہوں نے حالات اور واقعات پر پھر سے قابو پا لیا ہے اور وہ زخموں کے درد کی شدت کو بھول گئے ہیں یا ان کی شدت میں کمی آگئی ہے۔

شیخ صاحب آنکھیں بند، انہیں کچھ سکون سا محسوس ہوا۔ انہیں محسوس ہوا جیسے خوشیوں کی ہلکی ہلکی پھواریں ان کے ذہن پر گر رہی ہیں۔ ناک کے نتھنے خوشبو کے جھونکوں کو محسوس کر رہے ہیں جیسے کوئی ان کے کندھوں پر ہاتھ سے دھیمے دھیمے تھپک تھپک کر کہہ رہا ہے۔ شیخ صاحب نیکیوں کو گنا نہیں کرتے۔ نیکیاں

صلہ نہیں مانگتیں۔ نیکیاں نیکیاں ہیں۔ وہ تو نرا خوشیوں کا احساس ہیں۔ وہ خوشیوں کی نرم و نازک معطر لہریں ہیں۔ خوشبو کا شدید احساس ہیں نیکیاں بدلہ چاہتی ہی نہیں ——قربانیاں تو آدرش ہیں۔ ان کا تصور انسان کے دل پر سے بڑے بڑے بوجھ اتار دیتا ہے۔ دوسروں کا بوجھ ڈھوتے ڈھوتے کندھوں پر گٹے ضرور پڑ جاتے ہیں لیکن اس سے انسان کو جو دلی مسرت حاصل ہوتی ہے وہ دوسرا کوئی محسوس ہی نہیں کر سکتا۔ غموں میں بھی ایک لذت ہوتی ہے۔ اپنی ایک شان ہوتی ہے، آن ہوتی ہے، وقار ہوتا ہے۔ دوسروں کے لئے سہارا بننے والا مالی اور مادی فائدہ کبھی نہیں دیکھتا اسی لئے تو وہ خوشیوں کی جن لہروں پر سفر کرتا ہے اور احساس کی جن لذتوں سے لطف اندوز ہوتا ہے وہ اس کا اور صرف اس کا ہی حصہ ہے۔ شیخ صاحب نے یہ سب کچھ ایک لمحے میں ہی محسوس کر لیا۔

شیخ صاحب کے سفید بالوں اور جھریوں والے چہرے پر طمانیت کے آثار تھے اور جب انہوں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو دھند چھٹ چکی تھی۔ سورج کی سنہری کرنیں ترچھی ہو ہو کر دیواروں، بازاروں، دکانوں اور سڑکوں پر پڑ رہی تھیں۔ یہ کرنیں انہیں بڑی حسین معلوم ہوئیں۔ ان کرنوں کی روشنی میں جیسے خوشیاں لہرا رہی تھیں۔ ان کے دل میں ایک معصوم سا جذبہ ابھرا کہ وہ دوڑ کر ان ساری کرنوں کو سمیٹ لیں۔

چوراہے پر چہل پہل ہو گئی تھی۔ تانگے، رکشے موٹریں، سائیکلیں، بسیں بڑی تیزی کے ساتھ اپنے سفر پر رواں دواں تھیں، لوگ اپنے اپنے کاموں کی طرف کشاں کشاں چلے جا رہے تھے۔

شیخ صاحب نے چوراہا پار کیا۔ سامنے سے گڈو ان کی طرف چلا آ رہا تھا۔ اس کے ننھے سے چہرے پر خوشیوں کی لہریں رقصاں تھیں انداز والہانہ تھا۔ شیخ صاحب نے اسے اپنی گود میں اٹھا لیا بے اختیار ہو کر بار بار اس کا ماتھا چوما۔ ان کا دل خوشیوں سے بھر گیا تھا۔ گڈو ان سے لپٹ گیا اور شیخ صاحب سارے ہی غم بھول گئے تھے۔ گڈو چاہتا ہے کہ میں اس کے لئے زندہ رہوں۔ اس کی تربیت کروں۔ اس کے لئے خوشیاں مہیا کروں۔

گڈو! انھوں نے بے اختیار ہو کر ایک بار پھر گڈو کو چوم لیا۔ کرنیں شیخ صاحب اور گڈو دونوں کے چہروں کو منور کر رہی تھیں۔

بقیہ از صفحہ ۴۶

میری ہی طرح پہلی دفعہ یکبارگی اتنی بلندی پر دیکھا تھا۔ اب وہ بھی نیلگوں آسمان کی وسعتوں میں اُڑتے کبوتروں کے جوڑے کو توجہ اور دلچسپی سے دیکھ رہی تھی ٹھیک اُسی وقت ہوا کا ایک باغی جھونکا راستے میں حائل اُونچی چھت کو پاکر کے بے محابا ہمارے مکان کے چھوٹے سے صحن میں در آیا۔ میری بیوی ہوا کے جھونکے کی شرارت پر کسی قدر جھنجھلائی مگر وہ خفا کبھی بھی نہیں تھی۔ اُس نے اپنے مخصوص انداز سے اپنی ساڑھی کا پلّو ٹھیک کیا —— ہم دونوں درمیان میں حائل اُونچی چھت کے باوجود بلندیوں پر محوِ پرواز سفید مجراتی کبوتروں کے اُس جوڑے کو دیکھ رہے تھے جو نیلگوں بے کراں آسمان کی پہنائیوں میں دور تک اُترتا جا رہا تھا۔

لمحے کا زندانی

عابدہ نرجس

بس اُسے گاؤں کی طرف جانے والی پگڈنڈی پر اُتار کر آگے نکل گئی۔ تو وہ ناہموار راستوں پر پیدل ہی چل پڑا۔ اُس کے اٹھتے ہوئے قدموں میں تیزی اور بے صبری تھی۔ اس کے روئیں روئیں سے پسینہ اور بے کلی پھوٹ رہی تھی۔ اس کی رگوں میں اک لاوا سا خون کے ساتھ ساتھ گردش کر رہا تھا۔ اس کا چہرہ تپ گیا تھا اور کنپٹیاں سلگ رہی تھیں۔

کچھ فاصلہ تو اس نے اتنی تیزی سے طے کیا، کہ اس کا سانس پھول گیا۔ اس کے حلق میں کانٹے اُگ آئے اور اس کے دل میں گلاس بھر کر ٹھنڈا پانی پینے کی خواہش بھنور کی طرح چکرانے لگی۔ خواہش کے اس بھنور سے نکلنے کو اُس نے تھوک نگل کر حلق تر کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کا منہ خشک ہو رہا تھا۔ اُس نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ لیکن اس کے لب تر بھی نہیں ہوئے۔ اس کی رفتار میں خود بخود کمی آ گئی تھی۔

اس کے اُٹھتے ہوئے قدموں کی دھمک، اس کی بھاری چپل کی چُرمُر اور اسکے پاؤں سے ٹکرا کر لڑھکنے والے کنکروں کی آواز اس کے گرد چھائی ہوئی خاموشی کو جیسے زخمی کر رہی تھی۔ گرد و پیش پھیلے ہوئے اندھیرے کے سمندر میں تیرتا ہوا۔ وہ فاصلوں کو نگل رہا تھا۔ لیکن راستہ تھا کہ بڑھتا ہی چلا جاتا تھا۔ اس کے ہر قدم کے ساتھ جیسے اس کی منزل ایک قدم پیچھے ہٹ جاتی تھی، بل کھاتے ہوئے سانپوں کی طرح کلبلاتی ہو پگڈنڈیاں ایک دوسرے کے وجود میں اتر رہی تھیں اور ناہموار زمین پر پاؤں جمانا مشکل ہو گیا تھا۔

یہ سوچ کر اُسے جھرجھری سی آ گئی کہ اگر وہ اسی طرح راہ کی اذیتوں کا اسیر ہو کر رہ گیا تو اندھیرا اس کا ساتھ نہیں دے گا۔ اگر اُجلی صبح دھرتی پہ اُتر آئی تو اس کی راہ کی دیوار بن جائے گی۔ لمحے اس کے ہاتھ سے اسی طرح نکلتے رہے تو وہ بہت پیچھے جا پڑے گا۔ اس کا جی چاہا کہ بھاگ اُٹھے۔ فاصلوں کو پیچھے دھکیلتا ہوا۔ وقت کی طنابیں ہاتھ میں لیتا ہوا۔ اندھیرے کی کالی سیاہ چادر اوڑھے ہوئے اس دہلیز پہ جا کھڑا ہو۔ جو اسکے لئے نفرتوں کی سرحد تھی جس کے پار وہ کالا پھنیر سانپ اپنے بل میں گھسا بیٹھا تھا۔ جس نے اس کی ہنستی کھیلتی زندگی کو زہر سے بھر دیا تھا۔ اس سے جذبوں کے سارے سجل اور شادمان رنگ چھین کر اُسے نفرت کے مکروہ سیاہ رنگ میں رنگ دیا تھا۔

زندگی جو کبھی اس کے لئے گنگناتے ہوئے پہاڑی جھرنے کی طرح مترنم اور رواں دواں تھی۔ یک لخت اک زہریلے لمحے میں منجمد ہو گئی تھی۔ نفرت اور اذیت سے بھرا ہوا جانگسل لمحہ جو اس کے سالمے وجود پر چھا گیا تھا۔ جس نے اردگرد کی خوبصورت جیتی جاگتی دنیا اس کی نگاہوں سے، اس کے محسوسات سے اسکی پہنچ سے بہت دُور کر دی تھی۔ وہ اسی ایک لمحے میں جیتا اور سانس لیتا تھا۔ اُسے محسوس ہوتا تھا۔ جیسے وہ اسی ایک لمحے میں پیدا ہوا تھا اور

اس ٹھہرے ہوئے ساکت اور متعفن لمحے میں مرجائے گا۔ یہ لمحہ ایک حصار سا بن کر اس کے گرد پھیلا تھا۔ وہ اس سے باہر قدم بھی نہیں نکال سکتا تھا۔ وہ اس لمحے کا اسیر ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ کولہو کے بیل کی طرح آنکھوں پر پٹی باندھے اسی ایک لمحے میں ہی چکر لگاتا رہتا تھا۔

اس حصار کے گرداگرد اُسے اپنی ماں، اپنی بہنوں اپنے تائے اور چچاؤں کے چہرے صاف نظر آتے تھے۔ ان چہروں کی سُرخ انگارہ آنکھوں سے شعلے برستے۔ جن کے چہروں پر نفرت کی لکیریں گہری ہوتی چلی جاتیں ۔ وہ نفرت کے کولھو میں انتقام کے فربہ بیج ڈالتے چلے جاتے۔ جب کالا سیاہ بدبو دار سیال ان بیجوں میں سے نکلنے لگتا۔ تو ان کھنچے ہوئے چہروں کے پتھر ایسے ہونٹوں پر اک خونی مسکراہٹ اک دراڑ کی طرح نمودار ہوتی اور نفرت کی گہری چکروں کا اک حصہ بن جاتی۔

اور وہ پھر اس لمحے کی سنگین دیواروں میں گھرا زندگی کو جھیلتا اور انتقام کے فربہ بیجوں میں سے سیاہ لیس دار سیال نچوڑتا رہتا۔ اس کی زندگی کے دس بھرپور سال گرد کی طرح اس لمحے کی دیواروں پر جم گئے تھے۔ مکڑی کے منحوس جالوں کی طرح چھتوں سے لٹک رہے تھے، اور تعفن کی طرح یہاں وہاں پھیلے تھے۔ وہ دس سال سے لمحے کے اس زندان میں جینے کی سزا کاٹ رہا تھا۔ دس سالوں کے ان گنت، اَدھ کھلے، نرالے اور سنہری لمحوں کے بجائے وہ اس اک ساکت اور منجمد لمحے میں جمود کی نذر کر دینے والی کیفیت میں جیتا رہا تھا۔ وہ گرد و پیش بہتے ہوئے وقت کے سمندر میں اسی ایک لمحے کے جزیرے میں قیدِ تنہائی کاٹ رہا تھا۔

وہ آج اُسی اذیت ناک لمحے کو ساتھ لئے جاتا تھا جو اس کی ماں کی مانگ میں راکھ بن کر بکھر گیا تھا جو اس کے سارے گھر پر آسیب کی طرح چھایا ہوا تھا جسے اس کے عزیزوں نے مٹھی میں بھینچ رکھا تھا۔ جو اس کے اندر جوالا مکھی کی طرح کھولتا رہتا تھا۔ وہ دس سال سے سنبھال سنبھال کر رکھے ہوئے اس لمحے کو اس کالے پھنیئر سانپ کی حویلی پر تان دینا چاہتا تھا۔ جو اپنی زہریلی پھنکار کے ساتھ اس کے گھر میں زہر کی تھیلی کی طرح اُگل آیا تھا۔

وہ رات کی بساط الٹنے سے پہلے اپنا کام کر لینا چاہتا تھا۔ وہ ایک قدم میں ہی سارے فاصلے سمیٹ دینا چاہتا تھا۔ وہ کالے پھنیئر سانپ کو زمین کھود کر نکال لینا۔ جو دس سال قید کاٹنے کے بعد آج رہا ہو کر آیا تھا۔ وہ اُسے ایک دن کی بھی مہلت نہیں دینا چاہتا تھا۔ وہ اس کی بُو سونگھتا ہوا۔ عین اس کمرے میں جا پہنچا۔ جہاں وہ بے خبر پڑا ۔ مکروہ آواز میں خراٹے لے رہا تھا۔

وہ اُسے فردِ جرم سنائے بغیر سزا نہیں دینا چاہتا تھا۔ وہ اس کے گھناؤنے گناہ سے اس کا چہرہ سیاہ کر کے اس کے سینے میں گولی اتارنا چاہتا تھا۔ وہ اُسے بتانا چاہتا تھا کہ اس کے باپ کی جان اتنی سستی نہیں تھی کہ وہ اِس کے عوض اپنی زندگی کے دس سال جیل کی سلاخوں کے پیچھے گزار کر حساب برابر کر دے۔ اس کا عوضانہ اس کی جان کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔

اس نے بندوق کی نالی کے ٹھوکے سے اُسے بیدار کیا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور مخبوط الحواس سا ہو کر اس کی جانب تکنے لگا تو اس نے بندوق کی نالی اس کے سینے پر رکھ کر اُسے بتایا کہ وہ کس کا بیٹا ہے، اور کونسا پرانا حساب چکانے آیا ہے۔ اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں ۔ اُسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ موت اس کے اتنا قریب آ گئی ہے۔

اس نے لبلبی پر انگلی رکھی اور رائفل اس کی طرف سیدھی کی۔ اچانک پردے میں سرسراہٹ ہوئی۔ وہ چوکنا ہو گیا۔ اس کی تیز اور مشکوک نگاہیں سارے کمرے میں دوڑنے لگیں۔ اور دروازے کے قریب ہلتے ہوئے پردے پر پہنچ کر ٹھٹھک گئیں اور ششدر سی وہیں رُک کر ٹھٹکتی رہیں۔ ایک لمحے کو سناٹے میں آ گیا۔ بندوق اس کے ہاتھ میں لرز گئی۔ پردے کے پیچھے وہ خود آنکھوں میں خوف و ہراس اور چہرے پر التجا لئے کھڑا تھا۔

اس کے اندر اور باہر جیسے اک بھونچال سا آ گیا تھا۔ بندوق کی لبلبی پر دباؤ دیتی ہوئی اس کی انگلی جیسے مفلوج ہو گئی تھی۔ وہ جو آواز پر صحیح نشانہ لیتا تھا۔ اس کا دل یوں دھڑک رہا تھا۔ جیسے زندگی میں پہلی بار بندوق ہاتھ میں لی ہو۔ اس کی پیشانی پسینے میں بھیگ رہی تھی۔ پردے کے پیچھے کھڑا ہوا وہ خود جیسے اپنی ہی طاقت سلب کر رہا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس کی نگاہیں اُسے ہولے ہولے پتھر کا بنا رہی ہیں۔

اس کے پاؤں زمین نے پکڑ لئے تھے رائفل کو تھامے ہوئے اس کے ہاتھوں میں حرکت کرنے

کی صلاحیت مفقود ہوگئی تھی ۔ انتقام ۔ انتقام کی آواز اس کے وجود کی دیواروں سے ٹکرا رہی تھی لیکن اس کے ہاتھ تعمیل سے منکر ہو گئے تھے اس کی آنکھوں کی ساکت پتلیاں اسی سمت گڑی تھیں جہاں وہ خود پردے کو تھامے کھڑا تھا۔ اس کی اپنی آنکھوں کی التجا اس کی جانب مقناطیسی لہروں کی طرح بڑھ رہی تھی ۔ اس کے ارادوں کی مضبوط چٹانوں میں بارود کی سرنگوں کی طرح پھیل رہی تھی ۔ اُسے محسوس ہوتا تھا، جیسے اُس کی مٹھی میں بھنچا ہوا لمحہ ابھی بھک سے اڑ جائے گا ۔ اور وہ ناکام و نامراد کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گا ۔

اس نے ایک جھرجھری سی لے کر سر جھٹکا ۔ یہ کون اس کا روپ دھار کر اس کے دس سال کی ریاضت برباد کرنے پر تلا ہوا تھا ۔ یہ کون تھا ۔ جو اس کے مقابل آئینہ بن کر کھڑا تھا ۔ یہ کون تھا جو اُسے ماضی کی سمت پوری قوت سے دھکیل رہا تھا ۔ وہ دانت کچکچا کر آگے بڑھا اور اس کا بازو پکڑ کر پردے کے پیچھے سے کھینچ لیا ۔ جو اس کی صورت پہنے کھڑا تھا ۔

کالا پھنیئر سانپ دیوانوں کی طرح اس کے ہاتھوں سے چھڑانے کے لئے لپکا ۔ "خدا کے لئے یہ معصوم ہے ۔ اسے کچھ مت کہنا ۔ میرا معاملہ تمہارے ساتھ ہے ۔" وہ التجا کرنے لگا ۔ لیکن بندوق کے ایک ہی بٹ نے اُسے خاموش کر دیا ۔

اس نے بیدردی سے اس کے بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر اس کا چہرہ اٹھایا اور غور سے اُسے دیکھنے لگا ۔ جو اُسے اس کے اپنے مقابل لے آیا تھا ۔ ان معصوم آنکھوں میں خوف و دہشت آنسوؤں کی طرح تیر رہا تھا ۔ اُسے محسوس ہوا کہ وہ ماضی کے منحوس لمحے سے اب تک نہیں نکل پایا ۔ اس کا باپ اس کے سامنے گھائل ہوا پڑا تھا ۔ وہ پردے کے پیچھے خوف و دہشت سے ساکت ہو گیا تھا ۔ اُس نے بندوق کی نالی جھکا دی اور ایک ہی قدم میں ماضی کے اس منحوس لمحے سے آزاد ہو گیا ۔

اختر انصاری اکبرآبادی

مجھ کو بخشا ادب کا تاج اُس نے
خوب سمجھا مرا مزاج اُس نے

طرزِ تحریر دیکھ کر گم ہوں
کیا خبر کیا لکھا ہے آج اُس نے

کر دیا زندگی سے بیگانہ
لے لیا عشق سے خراج اُس نے

آسماں پر ہے اب مزاج مرا
ایسے پوچھا مرا مزاج اس نے

کیا کمی کچھ مرے خلوص میں تھی
کیوں کیا مجھ سے احتجاج اُس نے

حسنِ بے تاج و تخت کیا نکھرا
جب سے ٹھکرائے تخت و تاج اس نے

ہر اشارے پہ انقلاب آیا
یوں کیا ہے دلوں پہ راج اُس نے

جو تھا کل تک جنوں سے میرے خفا
کیوں بلایا ہے مجھ کو آج اُس نے

اپنے اختر کے دل کو بخشا ہے
ہوش و مستی کا امتزاج اس نے

ماہِ نو

گوہر ہوشیارپوری

چھو کر جو اُسے صبا نہ آتی
پھولوں سے مہک ذرا نہ آتی

یہ رات بھی ہم گذار لیتے
پھر دوسری رات کیا نہ آتی

ہوتے بھی تو یوں جدا نہ ہوتے
آتی بھی تو یوں قضا نہ آتی

سچے تھے تو زہر پی نہ لیتے
جھوٹے تھے تو پھر حیا نہ آتی

یا بھول کے رہ گیا وہ ہوتا
یا جھوم کے پھر ہوا نہ آتی

چاہا تھا تو حشر کیوں نہ اٹھتا
ٹوٹے تھے تو کیوں صدا نہ آتی

گوہر یہ ہجومِ غمگساراں
مر کر تو کوئی بلا نہ آتی

محمود شارب

سچ کہوں میں مجھے ہوا کیا ہے
سچ کی معلوم ہے سزا کیا ہے

سب ہیں اپنے مزاج کے بندے
راہ زن کیا ہے رہ نما کیا ہے

ہر مرض کا علاج ہے لیکن
جانے یہ مرگِ لادوا کیا ہے

دوستوں نے مجھے بنامِ وفا
جز غمِ روز و شب دیا کیا ہے

سب فسانے ہیں زندگی کے ساتھ
بعد از مرگ ماجرا کیا ہے

جو مقدر ہے وہ میسر ہے
بددعا کیا ہے، اور دعا کیا ہے

اس جہانِ خراب میں شارب
میں ہی میں ہوں تو پھر خدا کیا ہے

غلام محمد ناصر

کہیں لوگ تنہا کہیں گھر اکیلے
کہاں تک میں دیکھوں یہ منظر اکیلے

گلی میں ہواؤں کی سرگوشیاں ہیں
گھروں میں مگر سب صنوبر اکیلے

نمائش ہزاروں نگاہوں نے دیکھی
مگر پھول پہلے سے بڑھ کر اکیلے

اب اک تیر بھی ہولیا ساتھ ورنہ
پرندہ چلا تھا سفر پر اکیلے

جو دیکھو تو اک لہر میں جا رہے ہیں
جو سوچو تو سارے شناور اکیلے

تری یاد کی برفباری کا موسم
سلگتا رہا دل کے اندر اکیلے

ارادہ تھا جی لوں گا تجھ سے بچھڑ کر
گزرتا نہیں اک دسمبر اکیلے

زمانے سے قاصرؔ خفا تو نہیں ہیں
کہ دیکھے گئے ہیں وہ اکثر اکیلے

غلام حسین ساجد

سبز کی ہے اس سلیقے سے زمیں زہراب نے
شہر بھر میں باندھ رکھی ہیں صفیں اعصاب نے

نیند سے باہر بھی دنیا تھی مگر میری نہ تھی
اک ذرا امید بخشی ہے شکستِ خواب نے

آسماں ہے اصل میں اک نیلگوں حیرت کا نام
آئنہ سا کر دیا اک دشتِ قحطِ آب نے

قطع ہو سکتی نہ تھی یہ نور کی چادر، مگر
اک خطِ گلزار کھینچا ہے کسی محراب نے

بہہ چکی ہے آنسوؤں کے ساتھ بینائی مری
چھین لی ہے شہر بھر کی روشنی سیلاب نے

کھینچ رکھی ہے کماں سی خاک اور دریا کے بیچ
شام کے پہلے کنارے پر جھکے مہتاب نے

ناز تھا ساجدؔ بہت تاریکیٔ دل پر ہمیں
آج یہ گھر بھی منور کر دیا اک خواب نے

نصرت صدیقی

حیات درد میں تحلیل ہو گئی کتنی
تمہارے حکم کی تعمیل ہو گئی کتنی

نظر اٹھائے نہ اٹھے ہلائے لب نہ ہلیں
بدن کے شہر میں تعطیل ہو گئی کتنی

تیرے بدن کی مہک میں لہو مرے دل کا
ملا تو پھول کی تشکیل ہو گئی کتنی

حسین پھول سے چہرے اداس اداس لگے
غمِ نہاں تیری تاویل ہو گئی کتنی

خموشیوں سے بھی منسوب ہو گئے قصے
ہمارے ضبط کی تفصیل ہو گئی کتنی

کہیں سے دیدہ و رو فرصتِ نظر لاؤ
جمالِ شعر کی تذلیل ہو گئی کتنی

سروں سے موت کے سائے نہیں ٹلے نصرتؔ
اگرچہ زندگی تبدیل ہو گئی کتنی

لطیف ساحل

سرِ شاخِ سبز، گلاب ہے کہ ہے آئنہ!
ترا روپ ہے کوئی خواب ہے کہ ہے آئنہ!

مجھے پھر سے اپنی تلاش ہے ترے رُوبرو
تجھے کیا خبر، یہ شباب ہے کہ ہے آئنہ!

مری خاکِ دیدۂ دل سے فصلِ گمان تک
کوئی شہر ہے کہ سحاب ہے کہ ہے آئنہ!

مہ ونجم ہیں کہ چراغِ وصل ہیں کُو بکُو
یہ شبِ فراق، حجاب ہے کہ ہے آئنہ

تری نفرتوں میں بھی چاہتوں کے نقوش ہیں
تری ذات ایک سراب ہے کہ ہے آئنہ!

مری وحشتیں، مرے دل کو سنگ نہ کر سکیں
مرا حال اب بھی خراب ہے، کہ ہے آئنہ!

میں چھپا سکا نہ کبھی بھی صورتِ حال کو
مرے روز و شب کی کتاب ہے کہ ہے آئنہ!

شاھدہ کیانی

گوشۂ گل میں بہاروں کو سجاؤں گی میں
اپنی روٹھی ہوئی تقدیر بناؤں گی میں

توڑ ڈالوں گی چھلکتے ہوئے ساغر کا غرور
آنکھ سے اشک کچھ اس طرح بہاؤنگی میں

کر کے تحلیل کبھی رات کے دامن میں سحر
شبِ غم کو بھی ـ ضیا بار بناؤں گی میں

شاید آنکلو کبھی پھول کی خوشبو کی طرح
اب نشیمن کو گلابوں سے سجاؤنگی میں

تیری یادوں کو دلِ و جاں میں بسانے کیلئے
زیست کے لمحوں پہ اک نقش سجاؤنگی میں

میں بھی اُس روشنی میں شاہدہ کھو جاؤں گی
اک دیا ایسا محبت کا جلاؤں گی میں

ایوب ندیم

دل حوادث کے سمندر میں اترنا سوچے
کرچیاں بن کے فضاؤں میں بکھرنا سوچے

نہ ملا جسکو میں اب تک، نہ جسے دیکھ سکا
وہ مجھے دیکھ کے کچھ دیر ٹھہرنا سوچے

وہ جو اک لہر خیالوں کی اٹھی تھی دل میں
وہ خلاؤں میں مجھے لے کے اترنا سوچے

حسرتوں کا یہ سمندر جو بہت گہرا تھا
ناتواں دل کسی حسرت میں ٹھہرنا سوچے

چشم کی قید اسے روک سکے کیسے ندیم
اشک تو صورتِ سیلاب بپھرنا سوچے

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کے دو نسخے ارسال فرمائیں)

نقد و نظر

جمال سویدا کے شعر شعر

انتخاب از حکیم اشعر دہلوی — ناشر: فنون پریس، میکلوڈ روڈ، لاہور

کتابت، طباعت بہت خوبصورت — قیمت: درج نہیں — تبصرہ نگار: میرزا ادیب

ایک شاعر اپنے کسی ہم عصر شاعر کا انتخاب کلام کرے تو ایک حد تک یہ گمان کیا جا سکتا ہے کہ اس انتخاب میں حسد کے جذبے کی بھی آمیزش ہوگی۔ اس نظریے کا ہر جگہ اطلاق نہیں ہو سکتا کیونکہ ہر شخص، ضروری نہیں کہ فریضۂ انتخاب ادا کرتے وقت حاسدانہ تنگ نظری یا معاصرانہ چشمک سے کام لے مگر ایک حکیم جب اپنے معاصر حکیم کے کلام میں سے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق پسندیدہ شعروں کا انتخاب کرتا ہے تو وہ پہلے حکیم ہوتا ہے اور پھر شاعر اور حکمت نام ہی انسانی کمزوریوں سے بلند ہونا ہے۔ اس لئے حکیم اشعر دہلوی نے حکیم محمد نبی جمال سویدا کے کلام میں سے جو سو اشعار چنے ہیں وہ دیانتدارانہ انتخاب ہی کے نتیجے میں منظرِ عام پر آئے ہیں۔ اس انتخاب کو بہرصورت صاف ستھرا انتخاب کہنا چاہیئے۔ حکیم اشعر دہلوی برصغیر کے اس عظیم خانوادہ حکما کے ایک فرد تھے جس کے آغوش تربیت میں حکیم اجمل خاں جیسے نامور، ممتاز اور یگانہ روزگار سیاست دان نے پرورش پائی تھی اور حکیم جمال سویدا انہی حکیم اجمل خاں کے رشتے میں پوتے ہیں۔ جن لوگوں کو حکیم اشعر نے ان کی زندگی میں دوستانہ روابط قائم کرنے کا موقع ملا تھا وہ جانتے ہیں کہ یہ صاحب ایک درویش صفت آدمی تھے۔ یاروں کے یار اور یاروں کے لئے بڑی سے بڑی قربانی کے لئے بھی تیار۔ وہ اس تہذیب کے سچے نمائندے تھے جو مغلیہ اقتدار کے خاتمے پر بھی دلی کے گلی کوچوں میں اپنا رنگ جمائے ہوئے تھی اور جس کے نام لیوا روز بروز کم سے کم ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ حکیم اشعر عربی زبان کے جید عالم تھے۔ لبنان کے فلسفی مصنف جبران خلیل جبران کی متعدد تصانیف کو انہوں نے نہایت خوبصورتی سے اردو میں منتقل کر دیا تھا اور ان کا یہ کارنامہ کبھی فراموش نہیں کیا جائے گا۔ حکیم اشعر مرحوم کا ذکر چلا ہے تو میں عرض کر دوں کہ حکیم صاحب ایک ایسے انسان تھے جو دنیا سے رخصت ہو کر بھی دلوں کی دنیا سے رخصت نہیں ہوئے۔ کاش ان کے بارے میں تفصیلاً لکھا جاتا۔ میں نے اوپر عرض کیا ہے کہ دلی کی تہذیب کے نام لیوا کم سے کم ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اس تہذیب کے بہترین نمائندے حکیم جمال سویدا ہیں۔ سراپا شائستگی اور پیکرِ خلوص و محبت، ان سے ملئے تو لگتا ہے کہ اسلامی تہذیب کی روایات ایک انسانی پیکر میں سمٹ آئی ہیں۔ اپنے دادا کی طرح حکیم جمال سویدا بھی شاعر ہیں۔ اس لحاظ سے میں سمجھتا ہوں کہ حکیم صاحب کو حکمت کے علاوہ شاعری بھی ورثے میں ملی ہے۔ اس انتخاب کا پس منظر بتاتے ہوئے حکیم جمال سویدا نے لکھا ہے ۔" حبیب میاں (حکیم حبیب اشعر) اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ان کے گھر سے کچھ کاغذات اور کچھ فائل میرے پاس آئے۔ ان کا معائنہ کر رہا تھا۔ ایک مختصر سی کاپی پر نظر پڑی جس میں ونڈ اٹک کتابت شدہ اوراق رکھے ہوئے تھے اور یہ میرے نامکمل دیوان کا انتخاب تھا۔ کچھ دیر کے لئے دماغ ماؤف اور طبیعت گم سم سی ہو گئی۔ وہ زمانہ نظروں کے سامنے آگیا جب استاد سے اس انتخاب کے بارے میں گفتگو ہوئی تھی۔ پھر یہ انتخاب میرے کاغذات میں ایسا سمایا کہ رفتہ رفتہ نسیان اس کے وجود کو چاٹ گیا۔" اور یہ گلدستہ طاق نسیاں آج زندوں کی دنیا میں آکر اپنی نکہت بکھیر رہا ہے۔ جمال سویدا کی شاعری ایک خوش ذوق شخص کی شاعری ہے۔ جو خوبی مجھے ان منتخب شعروں میں محسوس ہوئی ہے وہ ہے زندگی کے معاملات میں شاعر کا شائستہ سوچ، شائستہ رویہ اور شائستہ ردعمل۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے

درد کو اور بڑھانے کی دوا دیتے ہیں	یہ بھی منظور! کہ اس میں کوئی حکمت ہو گی
فاصلے جب ناپنے لگتا ہے ذوقِ جستجو	اپنے سایے سے الگ ہو کر گزر جاتا ہوں میں
تاج پوشی کے لئے کس نے بلایا ہو گا	سر بکف جا ہیئے! وہی دار کا قصا ہوگا
وہ مسافر جو تھک کے بیٹھ رہے	رہ گزر کا چراغ ہوتا ہے
زندگی کو جاوداں کرتی ہے مقصد کی لگن	ورنہ ہر انسان اک گرتی ہوئی دیوار ہے
تیرے در پہ جھکا نہیں سکتا	میرے سر میں ترا خیال بھی ہے

بادِ سُبک دست

مصنف: جوہر سعیدی
ناشر: بزمِ جوہر سعیدی ۳-۱ے ۵۸۸ لانڈھی کالونی کراچی نمبر ۳۰
تبصرہ نگار: ڈاکٹر وفا راشدی
قیمت: تیس ۳۰ روپے

جوہر سعیدی بزرگ اور قادر الکلام شاعر ہیں۔ اس دورِ نفسانفسی میں جن اہلِ قلم نے اپنی وضعداری و دلداری کے ساتھ فکری عمل کا بھرم قائم رکھا ہے ان میں جوہر سعیدی کا نام معتبر اور مقام محترم ہے۔ بادِ سبک دست، جوہر سعیدی کا پہلا شعری مجموعہ ہے جو ۵۴ سال چکی کی مشقت اور مشقِ سخن کا حاصل ہے۔ وہ نام و نمود سے ہمیشہ بے نیاز رہے۔ تمام اصنافِ سخن کی تخلیق و تدوین پر قدرت رکھتے ہیں لیکن غزل گوئی میں کمال حاصل کیا ہے۔ جوہر سعیدی نے روایت کا احترام کرتے ہوئے جدید تقاضوں کا بھی پاس رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں ان کے ہاں ایک استادِ فن کے زبان و بیان کا ادراک ملتا ہے وہاں موضوع اور مضامین میں نیا پن بھی دکھائی دیتا ہے۔ ماضی سے حال کا فکری رابطہ تسلسل اور توانائی کے ساتھ ملتا ہے۔ قدیم و جدید کے اس امتزاج نے جو بانکپن، انفرادیت اور ندرت پیدا کیا ہے اسے جوہر سعیدی کا اپنا رنگ و آہنگ کہہ سکتے ہیں۔ جوہر سعیدی کی غزل میں ان کی منکسر المزاجی درویشانہ طبیعت اور اخلاص و مروت کا رنگ بھی ہے۔ عصرِ حاضر کے نئے رجحانات کا بھرپور پرتو بھی۔ ان کا مطالعہ وسیع مشاہدہ گہرا اور تجربہ بیکراں ہے۔ ان کا کلام زندگی سے پیار اور عرفانِ ذات کا مظہر ہے۔ اسی دیگر خصوصیات نے ملکر ان کی غزل کو امر کر دیا ہے۔ جوہر سعیدی کو غزل میں بات سے بات نکالنے کا جو ڈھنگ آتا ہے وہ ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ مسائلِ زندگی، رومانی فضا، محبوب کا رشتہ، اپنی زمین کی ہر چیز سے والہانہ محبت، بڑوں کا احترام، چھوٹوں سے شفقت آلامِ روزگار، غمِ جاناں، غرض یہ کہ حیات و کائنات، انسانی اور انسانی زندگی کا وہ کونسا پہلو ہے جس نے ان کی غزل میں جگہ نہ پائی ہو۔ یہ سب کچھ ان کے اپنے مخصوص لہجے، منفرد آہنگ اور خاص اسلوب میں موجود ہے جس کی بدولت ان کی غزل رنگِ تغزل کا اعلیٰ نمونہ ہے یا زندہ جاوید غزل کا پُرکشش آئینہ۔ ہمیں یقین ہے کہ جدید اُردو غزل کے تذکروں میں جوہر سعیدی کی غزل کو جائز مقام حاصل ہوگا۔ رنگِ سعیدی کے چند اشعار دیکھیے ؎

؎ شب پرستو! درِ امکانِ سحر بند کرو — مجھ سے پہلے مرے خوابوں کو نظر بند کرو

؎ ٹوٹ جائے گا مرا سلسلۂ تارِ نفس — تیرے غم نے بھی اگر راہ نہ پائی مجھ میں

؎ وادیٔ فکر و نظر میں جوہر — گونج آوازۂ حق کی صورت

سچائیاں [شعری مجموعہ]

شاعر: رشید الزماں خلش کلکتوی
ناشر: بزمِ شعر و ادب، اسلام آباد
تبصرہ نگار: سعادت سعید
قیمت: تیس ۳۰ روپے

ڈاکٹر رشید الزماں خلش کلکتوی ایک کہنہ مشق شاعر ہیں۔ اس شعری مجموعے سے قبل ان کا کلام کیفیاتِ خلش کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی، پروفیسر علی سجاد مہر اکبرآبادی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر حسرت کاسگنجوی، رئیس امروہوی نے سچائیاں کے فلیپ پر شاعر اور اس کی شاعری کے بارے میں بڑی درست اور مفید آرا دی ہیں۔ میں اور میری شاعری کے عنوان سے خلش کلکتوی نے اپنے بارے میں بھی بہت کچھ لکھا ہے اس مجموعے میں حمد، نعت اور منقبت کے بعد غزلیں، نظمیں اور قطعات بھی دستیاب ہیں۔ خلش کلکتوی قادر الکلام شاعر بھی ہیں اور فنِ شعر کے ماہر ناقد بھی۔ عروض اور زبان پر ان کی گرفت بہت مضبوط ہے۔ کلیدِ عروض، مستعمل بحور، معائبِ سخن، صحتِ زبان، چند کثیر الاستعمال الفاظ اور ان کا صحیح تلفظ کے عنوان سے اس شعری مجموعے میں جو نثری ابواب شامل ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ خلش کلکتوی کی شاعری ریاضت کا ثمرہ ہے۔ یہ شعری مجموعہ غزل اور نظم کی روایتی ساکھ بحال کرنے میں بڑا اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔ غمِ جاناں، غمِ دوراں، تشخص کی تلاش، آزادی، اخلاقیات اور تہذیب و ایمان کے مسائل کا اظہار خلش کلکتوی نے پُر تاثیر انداز میں کیا ہے۔ خلش کلکتوی کی غزلوں میں حسن و عشق کے معاملات بھی ظاہر ہوئے ہیں اور صوفیانہ اور سماجی مسائل بھی۔ اسلام سے ان کی اکثر والہانہ محبت کی گواہی ان

کے بعض اشعار سے ملتی ہے، پاکستان اور نظریۂ پاکستان کے خالق شاعر اقبال سے ان کی عقیدت بے مثال ہے۔ ان کے نظریۂ شعر میں اصلاحِ معاشرہ کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ وہ شاعری کو بلند اخلاقی سچائی اور نیکی کی ترویج و اشاعت کے لئے وقف دیکھنا چاہتے ہیں۔ پاکیزہ اور ضمیر کو جھنجھوڑنے والی شاعری ان کا مطمعٔ نظر ہے۔ مسیحائیاں، عمومی فنی نقائص سے پاک، زبان کے براہ راست اور صحیح استعمال پر مشتمل ایک عمدہ شعری مجموعہ ہے جو نئی نسل کو ایک سطح پر تو فنِ شاعری سے آگاہ کرتا ہے اور دوسری سطح پر ان کی اخلاقی اور سماجی زندگی کا رہنما بھی ہے۔ خلش کلکتوی کی شاعری میں زندگی کے حقائق بھی دستیاب ہیں اور عصری تقاضے بھی۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے درست لکھا ہے۔" ان کے لئے شاعری ذریعۂ شہرت نہیں بلکہ اظہارِ ذات کا وسیلہ ہے نئے شاعر ان کے فنی سلیقے سے ہنرِ شعر سیکھ سکتے ہیں"۔ اپنے خیالات اور جذبات کا والہانہ اظہار اور سہلِ ممتنع کا تخلیقی استعمال خلش کلکتوی کی شاعرانہ مہارت کا جیتا جاگتا ثبوت ہیں۔

زخمِ فلسطین

مجموعہ ابیات : رشید نثار — طباعت : رحیم پرنٹرز ٹیپو روڈ، راولپنڈی

ناشر: ہارون رشید — سال اشاعت ۱۹۸۳ء — قیمت : ۱۵ روپے

ہمارا سب سے بڑا تشخص اسلام ہے، اور اس رشتے سے ہمارے دل میں اسلامیانِ عالم کی جو محبت اور تڑپ ہے وہ مثالی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ ہم جب اسیرِ غلامی تھے اس وقت بھی اپنے مظلوم بھائیوں کے لئے بڑے موثر انداز میں سینہ سپر رہے ساری دنیا کو للکارتے رہے۔ فلسطین کا المیہ تقریباً نصف صدی سے ہمیں بے چین کئے ہوئے ہے پاکستان بنا تو دردو سوز کی یہ دنیا ہمیں ورثہ میں ملی۔ کربلائے بیروت میں اسرائیل کی انسانیت سوز سیاہ نے حال ہی میں فلسطینی حریت پسندوں پر جو خونچکاں مظالم ڈھائے اُس نے ہر پاکستانی کو تڑپا دیا۔ رشید نثار ایک صاحبِ دل پُرجوش و پُرخلوص شاعر ہیں ان کا دل محبت سے لبریز ہے اور اس آشوب کے انتہائی کرب کا عکاس ان کا وہ کلام ہے جو انہوں نے زخمِ فلسطین کے عنوان سے مجتمع کر کے شائع کیا ہے یہ آہیں ہیں، ان کے نالے ہیں پُردرد اور اثر انگیز۔ اس مجموعہ کو شائع کر کے انہوں نے یقیناً جہاد بالقلم کیا ہے انہوں نے اس مجموعہ کے پیش لفظ میں کہا ہے۔ "فلسطین کی جنگ سے میں نے اپنی ذات کو کبھی علیحدہ نہیں سمجھا۔ اس لئے میری شاعری کا تناظر اور محورِ آزادیٔ فلسطین رہا ہے"۔ اور اس کی منہ بولتی تصویر۔ اس مجموعہ کا ہر شعر ہے۔ ان کے کلام میں جذبات کی "تلاطم خیز آندھیوں میں صداقت کا رنگ اور نکھر آیا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ جذبات نہ ہوں تو حیات" پتھر سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ اس مجموعہ میں آزاد نظمیں بھی ہیں اور پابند بھی، بعض میں سیاسی گرما گرمی کا مزاج زیادہ ہے، یہ بہر حال ان کا اپنا زاویہ ہے۔

طباعت مناسب ہے قیمت پندرہ روپے البتہ زیادہ معلوم ہوتی ہے۔

تحقیقِ غالب

مصنف : ڈاکٹر سید معین الرحمٰن — ناشر : اُردو اکیڈمی سندھ، کراچی

صفحات : ۲۸۸ — تبصرہ نگار : شمیم احمد

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کی کتاب "تحقیقِ غالب" کے حرفے چند میں یہ پڑھ کر بڑا لطف آیا کہ:

کمال یہ ہے چائے خانے یا کافی ہاؤس کو مستقل زینت بخشنے والے سال خوردہ جوان اور راوی بنانے یا نیم ادبی کالموں میں جگہ پانے کی فکر میں زندگی بتانے والے بھی تحقیق کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں! اب ڈاکٹر صاحب کو یہ کون بتائے کہ یہ اہلِ تحقیق کو تو خیر کیا گھاس ڈالتے تنقید کو بھی اپنی برساتی شاعری یا چند ورقی افسانوں کے سامنے کارِ بیکاراں خیال کرتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ اُردو شعر و ادب کے ہر دس سال میں ایسی پچاس ہزار برساتی مخلوق پیدا ہوتی ہے۔ جن کی ٹرٹراہٹ دس سال بھی سنائی نہیں دیتی اور یہ سمجھتے ہیں کہ تخلیق کا آسمان انہوں نے سر پہ اٹھا رکھا ہے!!

اس جملۂ معترضہ سے قطع نظر یہ بات یقیناً قابلِ غور ہے کہ جدید نثر کے دورِ اوّل کے اہلِ تحقیق کے

مقابلے پر ان کی دوسری نسل کے محقق اس پائے کے ثابت نہیں ہوئے جیسے حافظ محمود شیرانی، پنڈت دتاتریہ کیفی اور مولوی عبدالحق تھے۔ غالباً اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ یہ نسل خود کو تحقیق سے زیادہ تنقید کے قریب خیال کرتی رہی جبکہ ان کی تنقیدی صلاحیت قدرِ اوّل کی نہیں تھی اور جب مجبوراً وہ تحقیق کی طرف مائل ہوئے تو وہ دقتِ نظر، محنت اور تہہ داری ان میں موجود نہیں تھی جو تحقیق کے فن کے لئے انتہائی ضروری خیال کی جاتی ہے۔

اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اُردو میں پی ایچ۔ڈی کرنے کا رُجحان تدریسی اور پیشہ ورانہ ضرورت اور افادیت کی وجہ سے عام ہوگیا، جبکہ ان میں سے اکثر مقالات تحقیق کے اس معیار پر پورے نہیں اُترتے جو مندرجہ بالا بزرگوں نے قائم کیا تھا۔ اور اب تو یہ کام اتنا اوچھا ہوگیا ہے کہ اس سے عبرت اور گھن (دونوں) آنے لگی ہے۔ ظاہر ہے کہ روز بروز معیار سے گرتی ہوئی پی ایچ ڈی کی ڈگریاں اہلِ تحقیق ہی کو بدنام کرتی ہیں جس کا اصل سبب یہ ہے کہ جب تحقیق کا فطری جوہر اور علمی بنیاد ہی ایک سرے سے موجود نہ ہوگی تو تحقیق کہاں سے پیدا ہوگی؟

خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ پچھلے پندرہ سال میں نہ صرف پچھلے دور کے گرتے ہوئے معیارِ تحقیق کی تلافی تین ناموں نے کر دی ہے بلکہ یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ جب تک کسی شخص میں تحقیق کا فطری جوہر اور بنیادی خصوصیات موجود نہ ہوں گی تحقیق میں کوئی قابلِ ذکر اضافہ ممکن نہیں۔ میری مُراد خود ڈاکٹر سید مُعین الرحمٰن ڈاکٹر جمیل جالبی اور برادرم مشفق خواجہ کے ناموں سے ہے جنہوں نے اپنے مُغتنم پیشرؤں قاضی عبدالودود، مولانا امتیاز علی عرشی، مالک رام اور ڈاکٹر غلام مُصطفےٰ خاں کی روایت کو برقرار رکھا ہے بلکہ اپنے قابلِ قدر تحقیقی کاموں میں تنقید کا جوہر بھی شامل رکھا ہے اور مستقبل میں ان سے بڑے بڑے کارناموں کی توقع رکھی جا سکتی ہے۔

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن ان نئے تحقیق نگاروں میں ایک معتبر مقام رکھتے ہیں ان کا تازہ تحقیقی کارنامہ "تحقیقِ غالب" کے نام سے سامنے آیا ہے جس میں انہوں نے غالب پر تنقید اور تحقیق کے بعض ایسے گوشوں پر روشنی ڈالی ہے جو نہ صرف تشنہ تھے بلکہ بعض بالکل نئے پہلوؤں کو بھی بے نقاب کیا ہے۔

"تحقیقِ غالب" کے مطالعے سے اب تک غالب پر جمع کیے ہوئے بیشتر مواد سے الگ ایک نئی جہت سامنے آئی ہے اور وہ یہ ہے کہ تنقید میں غالب پر بعض کار فرماؤں نے جس طرح اپنے حاشیے چڑھا کر بعض مفروضات کو غالب شناسی سے وابستہ کر دیا تھا۔ وہ مفروضات کتنے غلط تھے اور اسی طرح بعض ایسے ناموں کی پردہ کشائی کی ہے جو غالب کو چلتا سکہ سمجھ کر سرقے اور بے بنیاد قیاسات سے کام لینے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے۔ اس طرح تحقیقِ غالب نہ صرف ڈاکٹر سید مُعین الرحمٰن کی دقتِ نظر، علمی دیانت داری اور سلیقے کی ایک اہم مثال بن کر سامنے آتی ہے بلکہ تنقید کی بھی صحیح راستے کی طرف رہنمائی کرتی ہے کیونکہ بعض تحقیقی مفروضات اکثر اوقات تنقید کو بھی قیاسات کا شکار بنا دیتے ہیں۔

اِس میں کوئی شک نہیں کہ یہ کام بغیر ایک اچھے تنقیدی شعور کے ممکن نہیں جو ڈاکٹر سید معین الرحمٰن میں قابلِ لحاظ حد تک موجود ہے۔ اُن کی تحقیق میں بھی تنقیدی اسلوب، بذلہ سنجی، ادبی ذوق اور شعری پرکھ اس طرح شامل ہے کہ اگر "تحقیقِ غالب" کو "تحقیق" کے ساتھ ساتھ تنقیدی مجموعہ بھی قرار دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ تنقید بغیر تحقیق کی دریافت شدہ اصل حقیقت اور بصیرت کے زیادہ دیر تک اپنا بھرم قائم نہیں رکھ سکتی۔

"تحقیقِ غالب" میں مُعین الرحمان صاحب کے دس مضامین شامل ہیں جن کی اہمیت کا اندازہ ان کے عنوانات ہی سے ہو جاتا ہے:

خطوطِ غالب کے ادوار، غالب کا شعری رویّہ، ۱۸۵۷ء کے پس منظر میں، غالب کے بعد اُن پر پہلا مضمون، غالب اور مجروح کی مکاتبت، قطعۂ غالب بسلسلہ قضیۂ بُرہان، عودِ ہندی غالب کے خطوں کا پہلا مجموعہ، غالب کی معدوم تصنیفات اور تین مضامین "مدحِ گلِ رعنا" (غالب) کی دریافت اور اس کے اصل ماخذ سے متعلق ہیں۔ گویا ہر اعتبار سے غالب کے بارے میں ایک تازہ اور آئندہ زندہ رہنے والے مضامین پر مشتمل مجموعہ قابلِ قدر ہے۔ یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ یہ مجموعہ جہاں غالب کے سلسلے میں بہت سے جالے صاف کرتا ہے، وہاں غالب کے اصل خدوخال بھی خاصے واضح کر دیتا ہے۔